

خيالات

وَأَكْرَطِيَّبِ انْصَارِي

اشاعت باراول اکتوبر ۱۹۹۳ء

تعداد اشاعت

(۵۰۰) پانچ سو

کتابت

یسیم علی صاوب

طباعت

اعجاز پریس چھتہ بازار حیدر آباد

سورق

یسیم علی صاحب

طباعت

فیس بلاکس - چھتہ بازار حیدر آباد

ناشر

ادبی مرکز اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد

اس کتاب کی اشاعت کے لئے

انڈیا پرنٹس اردو اکیڈمی حیدر آباد کی جزوی مالی اعانت حاصل ہے

چلنے کے پتے

اسٹوڈنٹس بک ہاؤس

چارمینار حیدر آباد

جاسمی بک ڈپو

چارکمان پتھرگئی حیدر آباد

سب رس کتاب گھر

پنچ گٹہ حیدر آباد

مکتبہ رفاه عام

درگاہ بندہ نواز گلبرگ

روزنامہ سیاست

جواہر لال نہرو روڈ حیدر آباد

قیمت: ۳۵ روپے

برادرِ بزرگ !

مولوی محمد معین الدین الضاری

ہے

نام

○

عبد و مولا در یکینِ یک دگر
ہر دو بیتات اند، از ذوقِ نظر

○

بندہ اور خدا ایک دوسرے کی تلاش میں بے چین ہیں
دونوں ایک دوسرے کے مشتاق ہیں۔

○

تَرْتِیبُ

- ۷ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید
۱۰ ایک نظر خوش گزد
پیش گفتاری
ڈاکٹر طیب انصاری

۱۸

رشته فکر

۲۵

مقصد شعر

۳۶

وطنیت

۴۲

جاوید اقبال

۵۲

سیاست

۶۹

ذات رسالت

۸۱

حضرت انسان

۹۳

تلاش آدم

نئے سال کی دُعا

۵

”عہد حاضر کو علوم میں اپنی ترقی اور سائنس کی بے نظیر کامیابیاں پر ناز ہے۔ اس میں شک نہیں، اور یہ فخر بجا بھی ہے۔ آج زماں و مکان ختم ہو رہے ہیں، اور انسان اسرارِ فطرت کو بے نقاب کرنے اور اس کی قوتوں کو اپنے لئے تسخیر کرنے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔ مگر یاد رکھئے! انسان اس زمین پر صرف انسان کا احترام کر کے باقی رہ سکتا ہے۔ اگر تعلیمی قوتوں نے ساری دنیا کے انسانوں میں احترامِ انسانیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے زور نہ لگایا تو یہ زمین خون آشام درندوں کی شکار گاہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے آئیے! ہم نئے سال کو اس دُعا کے ساتھ شروع کریں کہ۔

قادرِ مطلق ان لوگوں کو جو طاقت اور حکومت کی جگہوں پر متمکن ہیں، انسانیت عطا کی ہے اور انہیں انسانیت سے محروم کرنا سکھا دے۔

۵

(علامہ اقبال کا پیامِ سال نو ۱۹۳۸ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایک نظر خوش گذرا

جب کوئی جوان سال اذیب یا نقاد اپنے فکر کے قبلہ کو ٹھیک کرتا ہے تو ہم جیسے بوڑھے انسان شناسوں کے دل میں خوشی کی ہریں رواں رواں ہوتی ہیں کہ یہ تلاش آدمیوں کی منتروں میں دوڑ رہا ہے۔
 کتاب "خیالات اقبال" اسی انسانی طلب کی امید افزا مثال پیش کرتی ہے۔ صاحب کتاب نے ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ "سب سے بڑھ کر کام احترام آدمیت کے جذبہ کو ابھارنا اور اس کو مربوط حکمت بنانا ہے"

از دل و جان شرف صحبت جانان فرض لیست

ہمہ ایست، و گرنہ دل و جان، ایں ہمہ لیست

اسی نے اقبال نے اپنے قاریوں کو چومکا دیا ہے کہ

میری نوائے پریشاں کو شاعری کا سمجھ

طیب صاب نے شاعری کے مختلف معیاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا

ہے کہ اقبال نے نگر صحیح کو اپنی شاعری کا معیار قرار دیا، اور اسی معیار

پر ہم عصر شاعری پر تنقید لکھا گیا ہے

طیب صاحب نے اقبال کے اس نکتہ پر نظر جانے کی بار بار

کوشش کی ہے کہ

جہاں تکرار کا افکار تازہ سے ہے نمود

حالی ادواتاں اپنے اوتقار کے اس ربط کو ظاہر کیا ہے اور یہ اس مضمون کا

خاص نکتہ ہے کہ "مصدق کی درد مندی اقبال سے شکوہ جواب شکوہ کھوالی ہے"

اقبالؔ کے تصور و طینت میں تدریجی وسعت کو طیب صاحب نے بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے :-

”واقعی یہی ہے کہ اقبال نے ہمالہ، ستوانہ ہندی، نیا
مشوالا اور ہندوستانی پختہ کلا گیت میں صرف قومی شاعر نہیں ہے بلکہ ان
میں بھی وہ حسن فطرت کے شیدائی، حب وطن کے انسانی جذبات کے ترجمان ہیں
نظریہ پاکستان پیش کرنے کے مقام کا ترانہ ملی سے پہلے نہیں ہے
ترانہ ملی اس سے بہت پہلے فکر اقبال میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ چار حانہ قوم پرستی
اور اپنے ہی وطن اور قوم کیلئے عظمتوں اور فائدوں کی گنتہ داری کو اقبال -
وطن دوستی نہیں سمجھتے۔ طیب صاحب نے نکتہ کو واضح کرنے کیلئے اقبال کے
اس شعر سے خوب بر محل کام لیا ہے کہ ۹

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ۔

گفتار نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

خود پرست قوم پرستی کی حقیقت اس طرح واضح کی ہے کہ ۱۰

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے

کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

یہ سچ ہے کہ اقبال کی تلاش ہندوستان یا پاکستان میں نہیں بلکہ روح قدس
کے ذوقِ جمال اور کائنات کی وسعتوں میں کرنی چاہیے ۔

خیالات اقبال کے آخری حصے میں جناب طیب انصاری صاحب نے

ایک بڑے پتہ کی بات کہی ہے ! ”مسلم سماج اور مسلم حاکم کے اندر ملیا جانا
یہ تضاد اسلام کی ترقی اور رواج میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔“

ابنہ کہیں کہیں تنقید کا تلخی بقول غالب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ

تمنّی سہمی کلام میں لیکن نہ اسقدر
کی جس سے بات اس نے شکایت فرد کی

اقبال کا رشتہ فکر خیالات اقبال کا ایک اور مضبوط رشتہ پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر
خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا ایک بلیغ قول نقل فرمایا ہے۔ جس سے ان قابل تحسین
تصوّرات کا سرا مل جاتا ہے۔

اقبال نے تمام اردو فارسی شاعری کا رخ پلٹ دیا ہے۔ یہ اکیلا
کارنامہ یعنی ملت اور نوع انسانی پر ایک احسان عظیم ہے۔

طیب صاحب نے اقبال کی محبت اور محبت کا حالی کی درد مندیوں
کے ساتھ جو رشتہ ہے اس کو مضبوط کیا ہے۔ اور ایک فراموش کی جانیوالی لڑکی
کی اہمیت واضح کی ہے اس پر بار بار زور دیا ہے۔ جاوید اقبال کے ابتدائی
نقرے ہی میں اقبال کے اکسیر محبت کی تاثیر کو رگ رگ میں پھونپھونانے کی کوشش
کی ہے۔ نوع انسان کی محبت اقبال کیلئے روح پرور شراب تھی۔ اسی
سے وہ جام و سبو کے بغیر مست رہتے تھے۔ خود ہی فرماتے ہیں ۵

شراب روح پرور ہے محبت نوع انسان کی

اسی سے میں نے سیکھا مست بے جام و سبو رہنا

ان کی یہی محبت اقبال کو بہترین انسان یعنی ذات رسالت تک پہنچاتی ہے
جناب طیب صاحب نے اسی عنوان کے ایک مستقل مضمون میں اس نکتہ کو
روشن کیا ہے کہ اقبال کو اس ذات کی محبت پر کیسا ناز ہے؟ یہ بھی بتایا
کہ اقبال کے کلام کا ایک اہم حصہ اسی عشق محمدی اور اس کی انسانیت نواز
عظمت کی منظوم تفسیر ہے۔ اقبال کے سارے فلسفہ اور شاعرانہ حسن
طرزی کا جوہر یہی ہے کہ ۶

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی

یہ چند کلمات ہدایت مختصر اور تنگ وقت میں لکھے گئے ہیں، کسی تفسیری تنقید کا یہ عمل نہیں ہے۔ پھر بھی یہ عرض ہے کہ خیالات اقبال کا یہ شیرازہ یا گلہ رستہ تلاش آدم پر ختم ہوتا ہے۔ طیب صاحب نے تلاش آدم میں اقبال کی گہری اور شوخی آمیز جستجو اور اس کی مختلف تعبیروں کو پراثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ خدا کی تخلیق کے مقصود، انسان کی تربیتی تعمیر ہی کو اقبال نے اعلیٰ انسانی جہاد اور سارے بنیوں کے حسین نمونوں کی کشش قرار دیا ہے۔ اس انسان کا کمال نمونہ اقبال کی تلاش کی نظر رحمۃ الغلیب کی شخصیت اور سیرت میں پائی ہے۔ یہیں تلاش آدم کی پیاس بجھتی ہے ۴

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداء است

رحمۃ العالمین ۲ انتہا است

اس مضمون میں صاحب تلم نے جگہ جگہ سیرت رحمت کے پہلوں کو دکھائے ہیں و روح پرورد خوش بوے اقبال کے رشتہ میں باندھ کر پیش نظر کیا ہے اس کتاب کو پڑھ کر یہی دعا بار بار دل سے نکلتی ہے ۴
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

رشید

(پروفیسر ڈاکٹر غلام دستگیر رشید)

پیش گفتاری

اردو ادب کی دنیا لا محدود ہے اور بے کراں بھی
ابوالکلام آزاد کی شخصیت نشر پر علاوہ اقبال کی شخصیت شعر پر محیط ہے
ان دونوں اکابرین ادب کی وجہ سے اردو ادب آبرو مند ہے اور سر فرو
بھی۔ آزاد اور اقبال کا موازنہ دلچسپ اور مفید ہوگا۔ لیکن میں یہاں
ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ تاہم یہاں ایک بات جو کہی جاسکتی ہے، وہ
یہ کہ دونوں کے افکار ایک ہی شجر سے چھوٹتے ہیں۔ میری مراد قرآن حکیم سے
ہے اور دونوں کا رہبر بھی ایک ہی ہے، یہاں میری مراد حضور اکرم صلعم کی
فات مقدس سے ہے، اور دونوں ہی برصغیر ہند کو اپنی جولان گاہ بنایا۔ گو
راہیں جدا جدا اور انداز کار مختلف تھے، لیکن دونوں ہی کے پیش نظر برصغیر
کے مسلمانوں کا سیاسی اور مذہبی تحفظ تھا۔ اس طرح دونوں کی شخصیتیں،
ہماری قومی زندگی میں رہبر و رہنما تھیں۔ جہاں افراد کی زندگیوں پر ہر دو مفکرین
سے اثر پذیر رہی ہے۔

ابتدائی عمر میں مولانا آزاد راست طور پر اثر انداز ہوئے۔ غبارِ
خاطر نے کتنوں کو متاثر نہیں کیا ہے۔ ایک زمانہ معترف ہے۔ پھر ان کے
سیاسی افکار اور مذہبی خیالات مختلف خطیبوں اور مضمون نویس کے ذریعہ
سے میرے ذہن و قلب پر اثر چھوڑتے رہے ہیں۔ علامہ اقبال علیہ السلام
مدد سرا ہے۔ طاہر کی کتاب ”جہان اقبال“ میری رہنمائی ہے
جب سن شعور کو پہنچا تو ڈاکٹر یوسف حسین میرے مفسر بھی تھے اور مدیر بھی۔
”روح اقبال“ کو میں اقبالیات میں غیر معمولی اضافہ سمجھتا ہوں۔ کلام
اقبال اسی تصنیف کی مدد سے میری روح میں حلول کر گیا۔ اقبال اب میرا

پسیدہ روئی تھا۔ ابتدائی عمر میں اکثر میں نے اپنے بڑے بھائی جناب معین الدین
الضاری اینڈ وکیٹ کو

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

گنگناتے سنا ہے۔ اصل میں ان کا تعلق جامعہ عثمانیہ کاس نسل سے ہے جس نے سیاسی اعتبار سے اقبال کے افکار کو ذہنی اور قلبی طور پر قبول کر لیا تھا۔ اقبال برصغیر کے شاعر تھے۔ لیکن حیدرآباد کو یوں اہمیت حاصل ہے کہ افکار اقبال کی گونج سب سے پہلے یہیں سنائی دی اور اقبال کو باضابطہ طور پر سمجھنے کی کوشش بھی یہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کو باغ عامہ حیدرآباد میں شاندار میلے پر "یوم اقبال" منایا گیا۔ اس کے بعد نواب حسنی یار جنگ کی کوششوں سے بزم اقبال کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر کارنامہ نواب بہادر یار جنگ کا ہے۔ جن کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اقبال کے تصوراتی مروجوں کی حقیقی اور جیتی جاگتی تفسیر و تفسیر تھے۔ ان کی دیوڑھی واقع بیگم بازار میں ہفتہ وار "درس اقبال" ہوا کرتا تھا۔ جس میں ماہرین اقبال درس دیا کرتے تھے۔ جن مفسرین اقبال نے ان محفلوں میں شرکت کی ہے ان میں جناب ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کی ذات باقیات الصالحات میں سے تھی۔ سنہ (۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۸ء) ان دس سالوں میں حیدرآباد کی فضا اقبال کے ترانوں سے گونجتی رہی ہے۔ اس دور میں اقبالؒ کی فہمی جو کوششیں رہی ہیں علمی و ادبی سطح پر وہ ہر آئینہ قابل ذکر ہیں۔

نظر حیدرآبادی نے اپنی تصنیف "اقبال اور حیدرآباد" میں

اُن تمام کوششوں کا ذکر موثر انداز میں کیا ہے جن کے ذریعے اہل حیدر آباد نے اقبال کو اپنا "پیررومی" بنایا تھا۔ وہ لکھتے ہیں "یہ خانہ اقبال سے بھی نے بقدر ظرف اپنے اپنے پیمانے بھرے ہیں، پی ہے مہذہائی ہے ادھائیگ عالم کو اس سرور سردی سے آشنا کیا ہے، جو اقبال کی روح میں موجزن رہا ہے۔ ان روشن غیر قدح خواروں کے سامان کیف و سرور پر نظر ڈالنے سے یہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ سمجھوں نے اقبال کی زبان اقبال سے ہی التجا کی ہے کہ

تو میری رات کو بہتاب سے محروم نہ رکھو

تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

عشق و جنون کے اس دھبے میں خرد کی جو مستعلیں جلی ہیں ان کی تعداد بقول نظر ۲۳ ہے۔ ان میں قابل ذکر روح اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین) اقبال کا تصور زمان و مکان (ڈاکٹر رفی الدین صدیقی) مقام اقبال (اشفاق حسین) اثرا اقبال (دستگیر رشید) زور اقبال (ڈاکٹر میر ولی الدین) فکر اقبال (خلیفہ عبد الحکیم) اقبال ایک جدید تشکیل (غیر احمد) اور حکمت اقبال (دستگیر رشید) ہیں نظر نے جن اقبالی نوجوانوں کا ایسی تصنیف میں ذکر کیا ہے ان میں ڈاکٹر محمدی الدین زور، اکبر وفا قاتی، سکندر علی وجہ، محذوم حمی الدین، میکش بدر شکیب، آرام، رشدی، اشک، امیر، باقی، رشید اور وفا آگے چل کر نامور ہوئے۔ جامعہ کے قیام سے قبل بھی اقبال کا اثر اہل حیدر آباد پر رہا ہے۔ جن شاعروں نے اسی زمانے میں اثر قبول کیا ان میں عظمت اللہ حنا علی منظور، تنکین سرمست، طاہر علی خاں مسلم، افضل بھٹائی، توفیق، کیفی، محمد اور علی اختر نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ اقبال ضمنی کے سلسلے میں حیدر آباد کا خصوصاً ذکر اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ یہاں اقبال کی

نہ صرف عوامی سطح پر قدر افزائی ہوئی بلکہ اقبال کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش بھی کی گئیں۔ اور اقبال کو واقعی ایک قوی مفکر کی حیثیت اسی شہر میں ہوئی ہے۔ آگے چلکر حیدرآباد کی تقلید میں ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگوں نے اقبال کو سمجھنے اور اس کے کلام سے مستفید ہونے کی کوشش کی ہے۔ تاہم میں وثوق سے کہوں گا کہ اقبال فہمی کی ہند گیر کوششوں کے نتیجہ میں اقبال پر ایسی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ جیسی کہ حیدرآباد میں ڈاکٹر یوسفین نے روح اقبال کے نام سے لکھی تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعد کو مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان تصانیف میں روح اقبال والی بات کہاں ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی منائی گئی، اس کے نتیجہ میں اقبال سے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اقبال کو سمجھنے کیلئے جلسوں کا اہتمام ہوا، لیکن میرے خیال میں وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جو کلام اقبال کا تقاضا ہے علمی اور ادبی اعتبار سے اقبال کے بارے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی لکھا گیا۔ چونکہ ان تحریروں کا تعلق محض ذہن سے ہے۔ اس لئے کلام اقبال قلب انسان پر اثر انداز نہ ہو سکا، اور اگر نہیں ہوا ہے تو کچھ نہیں ہوا۔ کیونکہ اقبال کا مقصد قلوب کو گرمانا تھا! قاری کے قلب و ذہن میں فکر کے چراغ فروزاں کرنا تھا! قوائے جسمانی میں حرکت و حرارت پیدا کرنا تھا، اور اس سے بڑھکر احترام آدمیت کے جذبہ کو عام کرنا تھا۔ یہ نہیں ہوا، اور اس کے علاوہ سب کچھ ہوا تو میرے نزدیک کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

اقبال فہمی سے متعلق جو کتابیں آئیں ان کی ایک ڈھیر سی لگ گئی ہے ان میں سے چند کا میں یہاں ذکر کروں گا، سرسری! اقبال کے متعلق ترقی پسندوں کا رویہ ابتدائاً مہاندانہ اور مخالفانہ تھا، اسی رویہ کو برقرار

رکھتے ہوئے، مجنوں اور انقرائے پوری نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی، اور اقبال کو رجعت پسند، فرقہ پرست، مافی پرست اور فاشسٹ اور جانے کیا کچھ لکھ دیا تھا، لیکن آگے چل کر اسی قبیل کے شاعر اور نقاد سردار جعفری نے اقبال شناسی لکھ کر تلافی کر دی ہے۔ سردار نے کہیں زیادہ صحیح انداز فکر اختیار کیا ہے اور اقبال کو سمجھنے کی مثبت کوشش کی ہے۔ رشید احمد صدیقی، مولانا صلاح الدین احمد، وقار عظیم، عبدالمجید لکڑی، ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد فرمان فتحپوری، اور ابو محمد مصلح نے اقبالیات کے مختلف عنوانوں پر قلم اٹھایا ہے "اس صدی" کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد ماہر اقبال بن کر ابھرے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزاد کو اقبال کا قرب حاصل رہا اور انہوں نے ذہنی طور پر اقبال کے انداز کو قبول بھی کیا ہے۔

اس بیچ سلیم چشتی کی حیثیت صرف اس مفسر کی ہے جو کلام اقبال کی شرحیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر عبداللہ، رشید احمد صدیقی، سردار جعفری اور وقار عظیم جیسے ناقدین ادب کا تعلق ہے، وہ اقبال پر ایسا ہی قلم اٹھائیں گے جیسا کہ وہ غالب اور میر کے تعلق سے لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ ان شعرا میں اور اقبال میں بُعد المشرقین ہے، اس لئے ان کی تحریریں قابل اعتنا نہیں ہیں۔ مجھے اس وقت زیادہ دکھ ہوا جب ڈاکٹر یوسف حسین جیسا شیدائی اقبال بھی غالب اور آہنگ غالب پر قلم اٹھاتا ہے تو وہی انداز اختیار کرتا ہے جو اس نے روح اقبال میں اختیار کیا تھا۔ غالب کی

فنی حیثیت کا میں منکر نہیں ہوں، لیکن فکری سطح پر اقبالؒ سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی شاید اس "صدی" کا کرشمہ ہے۔ البتہ ظالمیاری کا انداز فکر کچھ اچھوتا اور تنکھا ہے اور انہوں نے اشتراکی روی میں بیٹھ کر اقبالؒ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میری کوشش سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ اقبالؒ کو ابھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اقبالؒ کو حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبالؒ محض شاعر ہی نہیں تھے وہ مفکر تھے اور دانشور بھی۔ انہوں نے اپنی فکر قرآن سے حاصل کی ہے۔ وہ اسلام کے حامی ہیں۔ اسلئے وہ تنگ نظر نہیں وسیع النظر شاعر ہیں۔ اسلام انسانیت کا نجات دہندہ ہے۔ یہ ایک عالمی راستہ ہے جس پر عمل کر تمام انسان فلاح کی منزل کو پاتے ہیں۔ وہ رشتہ اخوت میں جڑ جاتے ہیں۔ رنگ و نسل کے سارے تفرقے مٹ جاتے ہیں۔ جغرافیہ حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ ساری کوشش یہی رہی ہے، ازل سے کہ انسان، انسان کو پہچانے، باوجود غلوں دل کے آج تک ایسا نہیں ہو سکا ہے۔ مگر ایسا ہو کیا سکتا ہے؟ تا وقتیکہ ہم اسلام کو ان فی ضرورت نہ سمجھیں اور صدقِ دل سے اس پر عمل نہ کریں۔ اس وقت تک تمام انسان ایک دوسرے سے قریب نہیں آسکتے، اور محبت کا جذبہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ مذہبِ اسلام کو محض دوسرے مذاہب کی طرح جان لینا اور کسی مخصوص طبقہ کا مذہب سمجھنا کوتاہ فہمی ہے۔ اقبالؒ نے ماضی و ہندوستان کے مسلمانوں کے تشخص و ماضی کی انفرادیت کو باقی رکھنے کے لئے شعر نہیں کہے ہیں بلکہ یہ ایک پیام ہے نوعِ انسانی کے لئے۔ اور یہ

مہند و پاک کے تمام انسان دوستوں کا فریضہ ہے کہ وہ کلام اقبال کی روشنی میں اس عالمی و ہمہ گیر نظریہ حیات کو دنیا کے تمام باشندوں تک پہنچائیں۔
 دراصل یہی کلام اقبال کا بنیادی مقصد ہے۔

خود مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتداء کیا ہے
 کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے



میں شکر گزار ہوں استاد گرامی ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صاحب
 مرحوم کا کہ انہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ آج سے تقریباً چودہ سال قبل لکھا
 جب وہ گلبرگ تشریف لائے تھے

استاد محترم رشید صاحب کا انتقال ۲۵ مارچ ۱۹۹۲ء کی شب
 ہوا، اور تدفین مسجد قطب شاہی خیریت آباد (میدر آباد) کے قبرستان میں
 عمل میں آئی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید ایسا ماہر اقبال شائد ہی اب پیدا ہو۔
 اللہ تبارک تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر طیب انصاری

۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء ۴۷ شوال ۱۴۱۳ھ

المنیر

10-3-5/6/1

مہدی پٹنم۔ میدر آباد (اے پی)

500028

ہرشت فیکما

پروفیسر میکسنڈی نے پیغمبر اور شاعر سے متعلق ایک بلیغ بات کہی ہے۔ عمر حافر کے سائل، دشواریوں اور مصائب کے پیش نظر انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا جو شاعری اور پیغمبری کے دو گانہ صفات سے متصف ہو۔۔۔

ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے غنظر ہیں جو وضاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفات الہی کے جلوے دکھائے۔ "شاہد یہی وجہ تھی کہ ہائینے نے خود کو "روح القدس کا سپاہی" اور اقبال نے شاعری کو پیغمبری کا جز قرار دیا تھا۔ اقبال کو احساس تھا کہ وہ فن، وہ ہنر میں کا مطیع لفظ اخلاق الہی کو اپنے اندر جذب کرنا (تخلّقوا یا خلاق اللہ) بے دراصل ان کے اندر ایک غیر محسوس طلب پیدا کرنا ہے، اور انجام کار اسے اس زمین پر اللہ کی خلافت کا مستحق ٹھہرانا ہے۔" اقبال نے اپنے قول کے ذریعے جہاں شاعر کے مرتبہ کا یقین کیا ہے۔ وہیں اس صداقت کو بھی واضح کیا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے شاعری کی کیا اہمیت ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام شاعری کا اجازت نہیں دیتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بانی اسلامؐ نے یقیناً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سر دار قرار دیا تھا جو جہنم میں ہانک دیئے جائیں گے، لیکن معنی و صورت کی پاکیزگی اور طہارت شعر عشرہ کو سن کر آپؐ محفوظ بھی ہوئے تھے۔ ایک دفعہ قبیلہ بنو عیس کے مشہور شاعر عشرہ کا شعر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا جس کا مطلب ہے "میں بہت سی رایت محنت و مشقت سے بسرگی ہیں تاکہ اہل حلال کے قابل ہو سکوں۔" اس شعر کو سن کر آپؐ اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ "کمی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس

سے شوق ملاقات نہیں پیدا کیا، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔“ (مضامین اقبال ص ۷۷) اس واقعہ نے شاعر کی تہی جہت اور نئے رُخ کا یقین کیا ہے۔

اقبال دیدہ و بینا شاعر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا نظر عمیق تھی۔ علوم دینی اور دنیوی میں یدِ طولی رکھتے اور فلسفہ کے عالم تھے۔ عالمی سیاست کے پیچ و خم واقف اور محرم راز درونِ بچانہ اُس نے انہوں نے اپنی شاعری کی باگِ امراءِ القیس کی تہیں عنترہ کی راہ کی طرف موڑی اور اپنی شاعری کو جزوِ پیغمبری بنایا۔ میکسنزی کو جس شاعر کا انتظار تھا، اقبال کی صورت میں وہ شاعر مل گیا۔ یہ اُردو اور فارسی کی خوش بختی ہے کہ اقبال ترسیلِ فکر اور ابلاغِ خیال کے لئے ان زبانوں کا انتخاب کیا۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اقبال کے اولین مخاطب ہیں، ورنہ اقبال کا پیامِ عالمی، آفاقی اور ابدی ہے۔

ناقیدین اقبال نے فکر و خیال کے ڈانڈوں کو اُردو، فارسی اور انگریزی کے مختلف شاعروں سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ اور فلسفہ کی دنیا میں مختلف مکاتب سے ان کا رشتہ جوڑا ہے۔ اقبال اپنی طرز کے منفرد شاعر تھے۔ فکر و خیال کے اپنے مکتب کے وہی بانی بھی ہیں اور پیرو بھی۔ یہ بات الگ ہے کہ ابتدائی دور میں اقبال نے اُردو فارسی اور انگریزی کے بے شمار شعراء اور مفکرین سے اثر قبول کیا ہے۔ لیکن اس اثر کے نتیجے میں یہ کچھ تا کہ خلاص شاعر پیدا نہ ہوتا تو اقبال پیدا نہ ہوتے ناقیدین کا اپنا انداز فکر ہے۔ اقبال تو عہدِ نو کے اس تقاضے کے نتیجے میں پیدا ہوئے جس کا اظہار میکسنزی نے کیا تھا، اور میکسنزی کے الفاظ میں اقبال ہیں شاعری اور پیغمبری کے دو گانہ صفات موجود ہیں اور ان کا شمار ان ہنرورانِ شعر میں ہوتا ہے جو نوعِ انسانی کو رحمتِ الہی سے ہمکنار کرتے ہیں

ان کا ربط اپنے ماحول حیات کے ساتھ ع بازمانہ ستیز کا ہوتا ہے۔ اقبال یسا بلند مرتب شاعر صیغۃ اللہ (ایہی رنگ) میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنی روح میں وہ زمانہ کی حقیقت و ابدیت کو محسوس کرتا ہے۔

اقبال کی ذہنی تربیت اور فن و نمایاں اردو کے میں شاعر کا نام سب سے پہلے لیا گیا، وہ غالب ہے۔ بانگ درا کے دیباچہ میں سر عبد القادر نے یہ لکھ کر کہ مرزا اسد اللہ خاں کو اردو و فارسی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے اس کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا، اور مجبور کیا کہ پھر کسی حجب و خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چین کی آبیاری کرے، اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔ اپنے تئیں سمجھا ہو گا کہ انہوں نے کوئی غیر معمولی بات بھی ہے!۔

اور شاید اقبال بھی چونکہ ابھی اقبال سے آگاہ نہ تھے، اس جگہ کو بڑھ مہرور ہوئے ہو گئے۔ بعض ناقدین اقبایات نے اسی شاعرانہ خیال کے بیش نظر غالب کو اقبال کا "پیر" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد نے لکھا ہے کہ "گو کہنے کو داغ سے تلمیذ تھا، لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے غالب کے شاگرد تھے۔ اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمہ ہے۔"

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات

ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

جنوں کو دیکھو وی نے غالب اور اقبال کے رشتہ فکر کی بڑے اچھے

مثالیں وضاحت کی ہے "اقبال اجداد کا پہلا شاعر ہے جو مفکر بھی ہے اور صاحب پیغام بھی۔ اندوٹ ہوئی میں فکر و ن کے میلان کی ابتداء غالب سے ہوتی ہے۔ لیکن غالب غزل گو شاعر تھے، اس لئے ان کا کوئی مدلل

اور منضبط فلسفہ رہا بھی تو وہ اس کو ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش نہ کر سکتے تھے۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں جابجا ان کا مفکرانہ انداز ظاہر ہوتا ہے، اور ہم کو نئے نئے فکر انگیز اشارے ملتے ہیں۔ ان کو خود احساس تھا کہ تنگدست غزل ان کے حوصلہ فکر کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اردو شاعری میں اقبال پہلی مہتری ہیں جن کو صحیح معنی میں مفکر کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کا بنیاد ایک خاص نظام IDEOLOGY پر ہے۔ ان کے خیالات میں ترتیب و تسلسل اور استدلال و نتیجہ نظر آتا ہے اور ان کے اسلوب میں بھی ایک ربط اور مضابط ہوتا ہے "اقبال کو خود بھی پیشرو غزل گو شعراء کی محدودیت ... کم مائیگی کا احساس تھا۔"

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا

ان کے اندیشہ قادیک میں قوموں کا نزار
اقبال و بختان داغ کے ممتاز فرد ہیں۔ ابتدا میں اقبال نے داغ سے اصلاح لی ہے اور ان کا اعتراف اقبال نے کیا ہے اور اسی طرح اقبال نے غائب سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن ذہنی طور پر وہ حالی سے متاثر رہے ہیں۔

مشہور زمانہ ہیں ہے نام حالی

معروف سے حق سے ہے حجام حالی

میں کشادہ مشعر کا بنی ہوں گویا

نازل ہے سرے لب یہ کلام حالی

بقول مجنوں اردو "نظم و نثر میں حالی اور آزاد نے جوئی کے چھڑی تھی اقبال نے اس کی تکمیل کی۔"

حاج حسن نے ڈرائیون کے اس قول کو دھرایا ہے کہ "تین زبانوں

میں تین شاعر دو تان، اٹلی، اور انگلستان میں پیدا ہوئے۔ پہلا رفعت تھیں
 میں سبقت لے گیا، دوسرا شاف و شوکت میں ادو آخری دونوں میں۔ قدرت
 اس میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی، اس لئے تیسرے کو بنانے کیلئے اس نے پہلے دونوں
 کو ایک ذات میں جمع کر دیا۔ یہاں ان کی مراد میر، غالب اور اقبال سے
 ہے، حالانکہ میر اور غالب ذہنی اعتبار سے اقبال سے مختلف شاعر ہیں۔ بقول
 خلیفہ عبدالحکیم "ہمارے غزل گو یوں ہیں میر تقی میر بڑا استوار گذرا ہے، اور اکثر
 بڑے بڑے شعراء نے اسے راد و کا ہے۔ میر کے نشتر بہتر ہوں یا ہزار سب میں
 ایک شکست خوردہ اور انفعالی کیفیت ہے۔"

شام ہی سے بھگسا رہتا ہے

دل ہوا چسراغ مفلس کا

غالب کے ظلمت کہ میں بھی شب غم کا ہی جوش ہے۔ شمع جو دلیں سحر ہے
 وہ بھی خاموش ہے! اس ظلمت کی وجہ سے دن اور رات یکساں ہو گئے ہیں
 جوں صبح میں غریبا ہی بہ شام مانند است
 چہ گوشت کہ ز شب چند رفت و تا چند است

اور یحییٰ سن کا قول دہراتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے
 کہ "اقبال نے اردو اور فارسی شاعری کا رخ پلٹ دیا اور یہ ایک ایسا عظیم اثر
 کا نظام ہے کہ اگر اس نے حکمت کے بیش بہا موتی اپنے کلام میں نہ بھی بکھرے
 ہوتے تو بھی یہ اکیلا کارنامہ اپنی پلٹ اور نوع انسان پر ایک بڑا احسان
 ہوتا۔ اچھا ہنر وہ ہے جس سے بقول یحییٰ سن ملتوی کے قلب استوار ہوں اور
 جو قوموں کا رخ انحطاط سے عروج کی طرف پلٹ دے" اور اقبال نے
 یہ کام طائی سے اثر قبول کرنے کے بعد انجام دیا۔ اقبال کے ذہنی لغو نما اور

اور پرداخت میں جس فکر نے حصہ لیا ہے، وہ فکر حالی ہے۔ جو انسانی درویشی سے عبارت ہے۔ اس لئے یہ کہنا محض ایک خیال ہے کہ اگر غالب پیدائے ہوتے تو اقبال پیدائے ہوتے۔“

شعر معنی اور صورت جیسے دو عناصر ترکیبی سے عبارت ہے۔ اگر اقبال پر غالب کا کوئی احسان ہے تو یہ کہ غالب کے اثر نے ان کی شاعری کو ابائی کچھڑی بننے سے بچا لیا۔ عقلی پیکر تراشی، میں وہ داغ اور غالب سے قریب ہیں، جب کہ ذہنی و فکری نشوونما میں انہیں حالی، آزاد اور شبلی نے زیادہ متاثر کیا ہے۔

اقبال ابھی مفکر تھے نہ فلسفی، وہ ابھی محرم راز درونِ مئے خانہ بھی نہ تھے۔ ان کی ذات اس پرندہ کی سی تھی، جو آب و دانہ کی تلاش میں قریب قریب اور جنگل جنگل بھٹکتا پھرتا ہے، دردِ در کی خاک پھانتا ہے اور اسی تلاش اور جستجو میں صبح شام میں بدل جاتی ہے، اسی لگ و دو نے انہیں اردو اور فارسی کے علاوہ جرمن اور انگریزی ادب سے قریب کیا۔ روحی تو اقبال کے لئے پیر تھے۔ انگریزی ادب کے مطالعہ نے اقبال کو نئی فضا اور نئے ماحول سے آشنا کیا تھا۔ وہ مغربی فکر سے متاثر تھے۔ مغربی جرمنی کے قیام نے علمی جواہرات سے ان کا دامن بھر دیا تھا۔ مارکس و لنین قریب ہوئے تھے۔ عجمی لئے اقبال کی شاعری کو رنگینی عطا کر چکی تھی۔ مغربی تعلیم نے گہرائی عطا کی۔ ہندو فلسفہ سے اقبال فطری گھاؤ رکھتے تھے۔ گوتم، رام، اٹھ گونامک کی انسانیت نے اقبال کی فکر کو نیا انداز عطا کیا تھا۔ لیکن ابھی اقبال کی تشکیلی پوری ہو نہ پائی تھی۔ ۵ تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ راز کی نہ صاحبِ کشف

اقبال غیر البشر کے حضور جہیں سائی کرتے ہیں ۹
 بعد از خدا بزرگ قوی قصہ مختصر!!
 پھر حیات کے اسرار کھلتے ہیں تب کہیں جا کر اقبال، اقبال سے نگاہ ہوتے
 ہیں۔ ۹۔ تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
 اسلام کا مقصد فقط ملتِ آدم
 پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ باہرکات اقبال کیلئے مونوتھی۔ اقبال نے عشق
 و عقل، خودی و بے خودی اور مردِ مومن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ تمام کا تمام
 اسی کا فیض ہے۔ اقبال کی شاعری قرآن کی تفسیر اور حضورِ اکرمؐ کا لفظ بن گئی۔
 میری ماں میں اقبال کے رشتہ فکر کو تلاش کرنے کے لئے جہاں ہیں غالب، امیر
 اور داغ کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہیں آزاد شہابی اور حالی کو بھی پڑھنا ہو گا۔ بلاشبہ
 مہندو فلسفہ، فادائی شاعری، اودا اور مغربی تعلیم نے درجہ کمال تک پہنچایا، لیکن
 اقبال کی تشکیں اور تعمیر میں اسلامی فکر نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ وہ عشقِ رسولؐ
 تھا، میں نے ان کے اندر احترامِ آدم کے قصود کو اُبھارا! اور بالآخر علامہ شبیر کی
 صورت میں اقبال کو ابدی، لافانی اور آفاقی زندگی عطا کی۔ اس سلسلے میں حالی
 معلمِ اول ہیں اور اقبال کا رشتہ فکر انہیں کے درپے ہوتا ہے۔

مقصد شعر

يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ اٰمَّا يٰۤاَتِيْنٰكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَقْصُوْنَ عَلَيْكُمْ
اٰيٰتِيْ فَمِنْ اَتَقٰى وَاصْلَحْ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۵

پرو پڑنے شعلہ مستوریں حضرت انبیائے کرام کے منصب سے
بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان پیغامات خداوندی کو لوگوں تک پہنچاتے
ہی نہیں بلکہ ان کا فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق معاشرہ
کی تشکیل کریں۔ یعنی ایک ایسا نظام قائم کریں، جن میں تمام انور کے فیصلے
قوانین خداوندی کے مطابق ہوں۔ یہ نظام اس جماعت کے ہاتھوں وجود
پذیر ہوتا ہے، جو بطیب خاطر قوانین خداوندی کا عمل و قیام پر ایمان لاتے
ہیں۔ اقبال نے اگر شاعری کو جزو ایست از پیغمبری کہا ہے تو اس سے انکا
منشا قانون خداوندی کے مطابق فرد کی بھی اور افراد کی تعمیر عالمی سطح پر ایک
صحت مند اور صالح معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اقبال ان معنوں میں پیدائشی
مسلمان تھے۔ انہوں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا، گو ان کے اجداد
برہمن تھے، لیکن اقبال ذہنی اور قلبی طور پر بھی مسلمان تھے۔ ان معنوں میں کہ
انہوں نے ذہن و قلب کی وسعتوں میں اسلام کو سمو لیا تھا، اور صمیم قلب سے
اس بات پر کمال یقین رکھتے تھے کہ بلاشبہ الدین اللہ کے نزدیک صرف
اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۝

اسی یقین کمال کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو قوانین الہی کی نشر
و اشاعت کے لئے برتا اور اسلامی تعلیمات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اقبال
کی شاعری ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ محض فیشن کے طور پر انہوں نے
اسلامی افکار کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ اگر ہم شاعری سے متعلق اقبال کے
مضامین کا مطالعہ کریں تو اس کی تصدیق ہو جائیگی۔ اقبال کے پیش نظر

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی تھی، جس میں انہوں نے امر القیس کو عظیم شاعر تسلیم کرنے کے باوجود ان شاعروں کا رہبر قرار دیا تھا جو جہنم میں جانے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اقبال نے شعر گوئی کے فن کو اختیار کیا ہے تو پوری ذمہ داری اور مکمل شعور کے ساتھ ہی کیا ہے، اور پیغمبر اسلامؐ کے قہر کی روشنی میں جہاں ہمیں کلام اقبال کا تجزیہ کرنا ہے وہیں اقبال کی اس شاعری سے وہی کام لینا ہے جو خود اقبال کا منشا تھا یعنی افراد اور جماعتوں کے کردار کی تعمیر اور عالمی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیں۔ چنانچہ اقبال نے خود بھی یاد دیا اپنے شاعرانہ ہونے کا اقرار کیا ہے اور قاری کو مجبور کیا ہے کہ ان کی نواسے پریشاں کو شاعری نہ سمجھیں۔ اقبال کو اس وجہ سے بھی اصرار تھا کہ اس دور میں جس قسم کی شاعری تھی (وہ سلسلہ آج بھی جاری ہے) وہ سراسر امراء القیس کی شاعری تھی یا ہے۔ چنانچہ حالی نے جو علم بغاوت بلند کیا تھا، اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔

اقبال نے فکر صبح کو اپنی شاعری کا معیار قرار دیا اور اسی معیار پر ہم عصر شاعری کی تنقید بھی کی ہے۔ وہ آج کے نقادوں کی طرح غالب کی شاعری پر واہ واہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں میری مراد ان نقادوں سے ہے، جنہوں نے غالب صدی میں پیسہ پٹورا، اور غالب پر بے شمار تنقیدی کتابیں لکھ دی ہیں، اور جب اقبال کا نمبر آیا تو اقبالیات کے مختلف پہلوں کو اپنی درست میں اُجاگر کیا اور ماہر اقبالیات کہلائے۔ اصل میں یہ پیشہ ور نقاد ہیں جن کا نہ تو کوئی نقطہ نظر ہے اور نہ ضمیر۔ وہ نہ اس طرح کا نفاذ خیالی کا کبھی شکار نہ ہوتے۔ اگر میں نے غالب کو یگانہ فن کہا ہے اور کہا ہے کہ اس نے نظموں کے سہارے حسین تاج محل قرا شہر میں، تو اس سے مراد

غالب کے فن کی تعریف کرنا ہے، فکر کی ہمیں ۷ اور جب اقبال کی عظمت کو تسلیم کرتا ہوں تو، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اقبال کا فن اور فکر، دونوں بھی معیاری قرار پاتے ہیں۔ جس طرح حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کو نماز پڑھنے کی تلقین کرنے پر مجبور کیا تھا، اسی طرح اقبال نے عصری شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے "دیوان مومن" کا ایک نسخہ اقبال کے مطالعہ کیلئے روانہ کیا۔ اقبال نے دیوان کی وصولی کی اطلاع دیتے ہوئے کلام مومن پر چند تنقیدی تاثرات کا اظہار بھی کیا، اس خط کو بنیاد بنا کر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ایک مضمون "آجکل" (سورخہ ۵ نومبر ۱۹۷۶ء) میں لکھا تھا۔ اس کے جواب میں میرا مضمون ۷، ہمارا اذعان (سورخہ ۵ نومبر ۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا۔ وہ مضمون میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

سلسلہ "آجکل" دہلی الکتوبر ۱۹۷۶ء میں یہ عنوان "اقبال اور مومن"
پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے مختصر لیکن اختلافی مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ظہیر صاحب نے اپنے مضمون کی بنیاد اقبال کے اس خط کو بنایا ہے جو انہوں نے پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کو "دیوان مومن" کی وصولی کی رسید کے طور پر ۹ نومبر ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا، اور جس میں اقبال نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ انہوں نے مومن کا کلام پہلی بار پڑھا، چند اعتراض کئے تھے۔ مثلاً یہ کہ ان کی شاعری سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ شاذ و نادیدہ وہ تغزل کے کسی حقیقی جذبہ تک پہنچ سکے (۱)، اُن کے خیالات طفلانہ ہیں (۲)، اور وہ اپنے جذبات کے سو قیام نہ پن کو چھپانے میں ناکام نظر آتے ہیں (۳)، اُن کے کلام میں وضاحت کی کمی سے نفسیاتی طور پر اس افسوس ناک امر کی شہادت ملتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا جذبہ حکمرانی انحطاط

پذیر ہو چکا تھا۔ (۴) گو یہ ابہام اس لحاظ سے قابل قدر بھی ہے کہ وہ اس
 رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ بیان کی وضاحت حکمران قوم کا خاصہ اور لازمی ہوتا
 ہے۔ یہ کیفیت یعنی وضاحت کی کمی جو من کے ہاں اس قدر عام ہے۔ قدرے
 کم حد تک من سے زیادہ بیش ذہنوں مثلاً غالب و بیدل میں بھی نظر آتی ہے۔
 اس مرضی ذہنیت کی دیگر علامات یا متابع میں قنوطیت اور نقوف بھی شامل ہیں
 جو ابہام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عدم وضاحت سے گمراہ ہو کر اسے معنویت کا
 درجہ دیتے ہیں۔

اقبال کا خط بہت مختصر ہے۔ ویسے بھی خطوط میں صرف دوائے ممکن
 ہے، وضاحت نہیں۔ وضاحت کیلئے تو دفتر چاہیے۔ اس لئے میرے خیال میں
 محض اس خط کو موضوع نہیں بنایا جاسکتا، اور اگر بنایا بھی گیا ہے تو ضرور تھا کہ
 ظہیر صاحب اقبال کی نظر سے مومن کو پڑھنے یا جاپنچے یا پھر مومن کے کلام کی روشنی میں
 اقبال کی رائے کو پرکھنے کی بجائے اقبال کے نظریہ شعری کو خود کلام اقبال کی روشنی
 میں پرکھنے کی کوشش کرتے، اس نتیجہ میں خود با سانی سمجھ سکتے تھے کہ اقبال
 نے صرف مومن کو ہی نہیں اس دور کے اساتذہ جیسے غالب کو بھی ناقابل اعتناء
 کیوں سمجھا۔ ۱۹!

ظہیر احمد صاحب نے خود لکھا ہے کہ اقبال نے خط کو اس وقت لکھا
 جب کہ وہ ذہنی طور پر اپنے مقصدی اور اصلاحی مشین کے قریب تھے۔
 "اقبال جب ویل" اور "ضرب کلم" کے خیالات ان کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکے
 تھے۔ اچانک ان کے سامنے ایک تغزل پسند شاعر کا دیوان آجاتا ہے۔ ظہیر
 نے زیر بحث خط اسی ردِ عمل کا نتیجہ ہے اور یہ ردِ عمل اور اس کے نتیجہ میں جو
 رائے ظاہر کی گئی وہ فطری ہے اور اقبال کے نقطہ نظر کے عین مطابق بھی ہے

بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ اقبالؔ نے ویسی تنقید نہیں کی، جیسی کہ ان سے امید کی جاسکتی تھی، اس کی وجہ بھی خط کی عدم گنجائش اور تنگ دامنی ہے۔ اقبالؔ کے لئے یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ وہ مومنؔ کے بارے میں کھل کر بحث کرتے۔ البتہ اپنے نظریہ شعری کا اظہار انہوں نے اپنی تقریروں، تحریروں اور شاعری میں کیا ہے۔ مجھے یہاں تفصیلات میں جلا نہیں ہے۔ لیکن اقبالؔ کے نظریہ شعری کا وضاحت کیلئے چند اشعار پیش خدمت ہیں، تاکہ قارئین خود اندازہ کر سکیں کہ مومنؔ کی تنقید میں اقبالؔ کس حد تک حق بجانب ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
 نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
 رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
 معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
 خونِ رگِ معمار کی گری سے ہے تعبیر
 مے خانہ حافظ ہو کہ بت خانہ بہرادر
 بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
 روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہ فریاد
 نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس
 نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
 سرود و شعرو سیاست اکتاب و دین و مہر
 گہر میں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
 ضمیر بندہ خاکی سے ہے نمود ان کی
 بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افانہ

یا یہ کہ

گو ہنرمیں ہنیں نقمیر خودی کا جوہر
و اے صورت گری و شاعری و غنائے و سرود

اور

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے ہنیں جہاں پیدا
بات ایسی نہیں ہے کہ ظہیر صاحب کو میں اقبال کے نظریہ شعری سے متعارف کروانے
جارہا ہوں۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے اقبال کے خط کو پڑھتے
ہوئے کلام اقبال اور نظریہ شعری کو کیسے فراموش کر دیا۔ انہیں اس بات پر
تعجب ہے کہ اقبال داغ کے شاگرد ہوتے ہوئے مومن و معتزض ہیں۔ لیکن مجھے
اس بات پر تعجب ہے کہ ایسے موقع پر انہیں حالی کی یاد کیوں نہیں آئی، جنہوں
نے غالب کے شاگرد ہونے کے باوجود غالب کے کردار اور گفتار پر کھلے بندوں
اعتراف کیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مقدمہ لکھ کر اس دور کی پچاسی شاعری
کو جو زیادہ تر غزل سے منسوب تھی بول و براز قرار دیا۔ قابل گردن زارنی کہا،
اور نئی شاعری کی ابتدا کی۔ اقبال اس میں غالب کی نہیں حالی کی ہی توسیعی
شکلیں ہیں، ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ سدس کے مطالعہ کے بعد
کلام اقبال کا مطالعہ فکر و خیال کا بلندوں کی طرف لے جاتا ہے۔ سدس کی درد
مندی اقبال سے شکوہ اور جواب شکوہ لکھواتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر
غالب نہ ہوتے تو اقبال پیدا نہ ہوتے مغالطہ میں ہیں۔ حقیقت قویہ ہے، کہ

حالی کے بغیر ہم اقبال کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اقبال نے جہاں غالب کی زبان سے استفادہ کیا ہے وہیں اس نے حالی کے خیالات و نظریات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لئے اگر اقبال مومن، غالب اور بیدل کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو یہ کوئی مقام میرت نہیں ہے۔ البتہ مقام غور و فکر ضرور ہے ویسے اقبال نے اپنی بات کی وضاحت محقق سے الفاظ میں خط کے آخری حصہ میں کر دی ہے۔ اقبال نے کبھی کہا تھا ۵

علم و فن از پیش خیزانِ حیات

علم و فن از خانہ زادانِ حیات

حیات کی موجودگی میں علم و فن کی کیا قدر و قیمت؟ اقبال نے انہیں پیش خیزان اور خانہ زادان حیات کہا ہے، اور اصحاً علم و فن کی حیثیت اس سے بڑھ کر ہو بھی نہیں سکتی اور پھر مومن اور غالب کا فن کس شمار و قطار میں ۵

یہ ایک نفس یا دو نفسِ شل شر کیا؟

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا

اے قطرہ نیاں! وہ صدف کیا وہ گہر کیا

یہ چند اشارے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو بصیرت رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ جو جو شعرا اور منصب شاعر کو سمجھتے ہیں، وہ ان باتوں پر غور کریں گے۔ آخر میں اقبال ہی کا ایک شعر نقل کر دوں گا، گو مخاطب مدیرِ محزن سے ہے۔ لیکن ظہیر صاحب بھی چاہی تو غور فرما سکتے ہیں ۵

مدیرِ محزن سے کوئی اقبال جلے میرا پیام بکدے ۵ جو کام کچھ کر ہی ہیں تو میں انھیں مذاقِ سخن نہیں اگر اقبال نے یہاں سخن کا لفظ استعمال کیا ہے تو ان کی مراد میر، غالب، مومن اور اسی قبیل کے دیگر غزل گو شعرا کی شاعری سے ہے۔

اقبال نے جس معیار پر مومن اور دیگر غزل گو شعراء کو جانچا ہے۔ ظاہر وہی معیار خود اقبال کی شاعری کا معیار قرار پائے گا۔ اس حیثیت سے اقبال کی شاعری جزویت از پیغمبری معلوم ہوتی ہے کہ اقبال نے قوانین خداوندی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اقبال نے جہاں زرتشتی، ہندوستانی، مارکسی اور مغربی افکار کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے فیضیاب ہوا ہے، وہیں انہوں نے قرآن حکیم سے بھی اکتساب کیا ہے۔ تاریخ اسلام ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے قرآن حکیم اور سیرت رحمۃ العالمین کا حقیقی اور آخری سرچشمہ فکر ہے۔

اقبال نے جمہوریت پر وار کیا ہے۔ کمیونیزم پر اعتراض کیا ہے، سرمایہ داری ان کی نگاہوں میں مجبئی نہیں ہے۔ وہ مرد مومن جس کی نگاہوں میں بصیرت قرآنی کی روشنی جلوہ بار ہو، بقول پرویز پرے حتم و یقین سے پیکار اٹھتا ہے اور اس تہذیب جدید کے جھوٹے ٹکوں کی ریزہ کاری سے ضرب کھانے والوں سے لڑکار کر کہہ دیتا ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شافعِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔
اپنے اس دعویٰ پر دلیل اقبال نے قرآن سے لائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔
وَالْعَصْرُ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ خَشِيرٌ ۚ
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۖ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۖ
نہ مانہ اس پر شاہد ہے کہ انسان یقیناً ناکام رہنے والا ہے۔
مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ کئے اور
ایک دوسرے کو حق استقامت کی تلقین کرتے رہے ہیں۔

اقبال نے دور حاصر کے محض سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی نظریوں کی نفی کی ہے اور اس کے برخلاف اسلامی نظریہ حیات کو پیش کر نیکی سعی مشکور کی ہے۔ دور حاصر کے نظر سے انسان کو انسان سے نزدیک کرنے اور ایک عالمی معاشرہ کی تشکیل میں محدود و محدود ثابیت ہونے کے بجائے اولاد آدم میں تفرق پیدا کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ آج ہم ہندوستان، پاکستانی ہیں، ایرانی و افغانی ہیں۔ ہم روسی ہیں چینی ہیں، امریکی و افریقی ہیں اور کالے اور گورے ہیں۔ چھوٹے بھائی کے مسائل انسانی تہذیب کے ناسور ہیں۔ زبان کے مسائل رسم الخط کے جھگڑے، دولت کی تقسیم اور جانے ایسے کتنے ہی مسائل ہیں جن سے دنیا آج دوچار ہے ان کا حل کون ڈھونڈ لگائے گا۔ انسان ہر ہر قدم پر ناکام اور نامراد ہے و مختلف گروہوں اور طبقوں میں بیٹ گیا ہے۔ اسلام اس کو وحدت کی تعلیم دیتا ہے۔ آپس میں بھائی قرار دیتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ مسلمان جو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک ہے، اور ایک رشتہ اخوت میں بندھا ہوا ہے وہ بھی بیٹ گیا ہے۔ اس کے درمیان جغرافیائی سرحدیں مائل ہیں۔ وہ کہیں اقلیت میں ہے اور کہیں اکثریت میں۔ حالانکہ وہ عالمی معاشرہ کا ایک فرد ہے چاہے وہ ہندوستان میں رہتا ہو کہ پاکستان میں، ایران میں رہتا ہو کہ ترکی میں، چاہے وہ روس میں رہتا ہو کہ چین میں اسی طرح وہ امریکہ میں رہتا ہو کہ برطانیہ میں وہ بھائی بھائی ہے، اور وہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک کل کا جز ہے اور کل سے مراد کل نئی نوع انسان ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے مسائل مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی عالمی مسائل ہیں۔ اور ان کے حل کو عالمی خطوط پر تلاش کرنا چاہیے۔ اگر ہم سارے انسانوں کو ایک جماعت

قرار دیتے ہیں تو ایسی صورت میں مسلمان بھی اسی جماعت کا ایک فرد نہوا۔
اور بقول اشتقاق حسین ”اقبال کے نزدیک فرد کا وجود جماعت سے الگ
نہیں۔ خلوت و جلوت دونوں اس کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں ۹

مجلوت ہم بجلوت نور ذات است

میان انجمن بودن حیات است

فرد کا وجود جماعت سے اس لئے الگ نہیں کہ بنی نوع انسان ایک رشتے
میں منسلک ہیں جس کی نوعیت حیاتی بھی ہے اور اخلاقی بھی، اور فرد کی
سیرت اور کردار جماعت میں ہی نشوونما پاتے ہیں۔ فرد اور جماعت کا یہ
ربط اس وقت ایک ہموار معاشرہ اور مہذب طرز معاشرت کا فلاح ہو سکتا
ہے، جب اسکا مطمع نظر سراسر انسانی ہو۔ اقبال کے ہاں فرد اور
جماعت کا یہی تصور ہے، ”اس طرح فرد کی ذمہ داری دو چند ہو جاتی
ہے۔ وہ خود اپنی اصلاح کرے، اس کی خودی بیدار ہو اور پھر معاشرہ
کی اصلاح کی طرف قدم بڑھائے۔ اس لئے اقبال نے اپنی شاعری میں
فرد کی تعمیر کا ایک واضح تصور پیش کیا ہے۔ فرد کی تعمیر یا خود کی اصلاح
کے بغیر صالح یا ہموار معاشرہ کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔ گو فی زمانہ مسلم
قائدین عجیبہ قسم کی دو محلی کا شکار ہیں، ایک طرف تو وہ اسلامی معاشرہ
کی تشکیل کی بات کرتے، اور دوسری قوانین کو نافذ کرنیکی کوشش کرتے
ہیں، اور دوسری طرف وہ خود قرآنی احکامات کی پابندی کرتے۔ مسلمانوں
کی سیاسی زندگی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایسے ہی افراد کے ہاتھوں میں مسلمانوں
کی حکومتیں کھلونا بنی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کیلئے لازمی ہے کہ وہ دنیا سے
غیر اسلامی قوانین کو مٹانے سے پہلے خود تمام بنیاد اسلامی سلطنتوں کی اصلاح

کریں۔ کیونکہ ایک قرآنی حکمت ہی میں قرآنی احکام کی ترویج ممکن ہے۔ مسلم سماج اور مسلم ممالک کے اندر پایا جانے والا یہ تضاد اسلام کی ترقی اور رواج میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اقبال کی تیز بین نظریں اپنے دور کی، بواجبی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے انہوں نے شاہی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

تیساوے رتن نے اقبال کے اسی انداز فکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال کا یہی وہ پیغام تھا جس نے مسلم ذہن کو جاگیردارانہ قیود سے نکال کر معاشرہ کو جدید ڈھانچے کے لئے تیار کیا، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہوگی..... ہر جگہ وہ نئے خاص توجہ سے سنے جائیں گے۔ جنہیں اسلامی احیاء کے داعی محمد اقبال قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے۔ (ماہنامہ شاعر جلد ۵۵ شمارہ ۱-۲ ص ۱۳)

اقبال نے اسلامی افکار سے دُشمنی محض اس وجہ سے نہیں رکھائی تھی کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اسلام ایک ایسا نظریہ حیات ہے جس کے ایجاب و قبول سے انسانیت کی فلاح اور بہتری ممکن ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تیساوے رتن نے بھی کیا ہے۔

”یہ شاید اقبال کی زندگی کے ایسوں میں سے ایک المیہ ہے کہ کوئی فرقہ وارانہ ذہن نہ رکھنے والا اور انتہا پسند وطن پرست کو صرف مسلم حقوق کا زبردست حامی قرار دے۔ یہ بات اقبال کی ہر اس بات کے برعکس ہے۔ جس کے لئے وہ ڈٹا رہا۔ وہ ایک سچا انسانیت پرست تھا۔ عالمگیر برادری کی بنیاد کے طور پر، محبت آزادی، اور مساوات کے اصول قریباً اس کے تمام نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ (حوالہ ایضاً)

وطنیت

اقبال نے جب ہمالیہ اور ترانہ ہندی جیسی نظمیں لکھا تو ملک کے ہر فرد نے انہیں ہندوستان کا قومی شاعر تسلیم کیا۔ اور جب اسی اقبال نے ترانہ ملی لکھا اور ۱۹۳۰ء میں نظریہ پاکستان پیش کیا تو پاکستانی شاعر قرار پائے۔ اور آج جب کہ اقبال ہمارے درمیان نہیں رہے یہ بحث گرم ہے کہ اقبال واقعی ہندوستانی شاعر ہیں یا پھر وہ پاکستانی شاعر ہیں۔ ملک کا کٹر طبقہ آج بھی اقبال کو اپنانے تیار نہیں ہے۔ جبکہ پاکستانی قوم نے اقبال کو اپنا قومی شاعر تسلیم کر لیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، دونوں ہی باتیں صحیح بھی ہیں غلط بھی۔ صحیح اس وجہ سے کہ گو اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں ہمالہ، ترانہ ہندی، نیا شوالہ، اور ہندوستانی بچوں کو گیت کے علاوہ رام، نانک اور سوامی رام تیرتھ پر نظمیں کہیں۔ اس لئے وہ ہندوستان کے قومی شاعر کہلائے۔ لیکن آگے چل کر ان کے نظریہ میں فرق آیا اور اقبال نے ہندوستان کے گیت لکھنے کے بجائے نہ صرف نظریہ پاکستان پیش کیا بلکہ ترانہ ملی لکھ کر ساری دنیا پر مسلمانوں کے حق کو جلدایا ہے۔ اقبال کی قومیت کے بارے میں کہی گئی باتیں اس وجہ سے غلط ہیں کہ

اقبال در حقیقت ہندوستانی ہیں اور نہ پاکستانی ہیں بلکہ وہ آفاقی نقطہ نظر کے حامل شاعر ہیں، اس نے ان کی عالمی حیثیت ہے ایسی صورت میں اقبال کو پاکستانی یا ہندوستانی شاعر قرار دینا، اقبال کی عظمت کو کم کرنا ہے اور خود کلام اقبال کی غلط تاویل کے مترادف ہو گا۔

اپنے وطن سے محبت فطری بات ہے۔ اور اقبال نے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے تو اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ وطن کی محبت کا یہ تخیل خالصاً غیر سیاسی بھی ہے۔ عبدالسلام ندوی کے قول کے مطابق یہ ایک نہایت شریفانہ اخلاقی بلکہ فطری جذبہ ہے۔ جس سے کسی شریف آدمی کا دل خالی نہیں ہو سکتا۔ حضرت بلالؓ کہ میں اس قدر ستائے گئے تھے کہ وہ وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ تاہم جب ان کو مکہ یاد آیا تھا، تو روتے تھے، اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے (اشعار کا مفہوم درج ذیل ہے)

(اے کیا بچی پھر وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں ایک رات بسر کروں اور میرے گرد ازخرو جلیل ہوں) (مکہ کی گھانسیوں کا نام) اور کیا وہ دن بھی ہو گا کہ میں غیر کے چنے پر اتروں اور شامہ و تخیل مکہ کے پہاڑ جھجے دکھائی دیں۔

اقبال آہنی وطن ہندوستان میں خاص کشمیر تھا۔ اس نے کشمیری وادی کے روح کی کلام میں وادی کشمیر حسن جمکنا نظر آتا ہے۔ ان نظموں تخلیق ہوئیں۔ ان کے کلام میں وادی کشمیر حسن جمکنا نظر آتا ہے۔

ہوتی عدن سے، محل ہوائے یمن سے دُور
یا نافہ غزال ہوائے شہن سے دُور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چین سے دُور

لیکن جیسے جیسے اقبال کا شعور ارتقائی مندرجہ طے کرنے لگا، اُن کے وطنیت کے
تصور میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ اُن ابتدائی رباعیوں کے بعد جب
بانگ درا ہمارے سامنے آئی تو اب اقبال کا وطن صرف کشمیر نہیں تھا بلکہ پورا
برصغیر ہندوستان کے خوابوں کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ ہمالہ انہیں پورے ہندوستان
کی نہیں نظر آنے لگا۔ اور جب انہوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر مشرق و
ہند کی لکھا تو سارے ملک کے بچے اور نوجوان سبھوٹ مل کر گایا یہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبل ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال نے ہندوستان کے سیکولر ہیرو کو نمایاں کرتے ہوئے ایک قومی گیت لکھا
جس کے بول ہیں یہ

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چین میں دشت کا گیت گھنایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بتایا جس نے مجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ایک دن آیا کہ اقبال کو خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آنے لگا۔ اور
بھگتوں کے گیت میں انہیں شکتی اور شانتی نظر آنے لگی۔ یہ زمانہ اقبال کی قومی
شاعری کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ اسی وطنیت کے جذبہ میں ڈوب کر
انہوں نے رام، نانک اور سوامی رام سیرت جیسے ہندو ہیمنادوں کو خارجِ عقیدت

پیش کیا ہے۔ ہم اقبال کی اسی قوی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں ایک قسم کا دالمانہ پن اور سچائی کی بوخون نظر آتی ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ وطن سے محبت کا یہ جذبہ زمانہ آخر تک باقی و برقرار رہا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ان کی نظم "مطلع امید" پیش کی جاسکتی ہے۔ بلکہ وہ یہاں کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ۴

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکزِ اقبال کی اشکوں کا یہی خاک ہے سیراب چشمِ مہ و پروین ہے اکا خاک سے روشن یہ خاک ہے جبکا خرف ریزہ درِ ناب اس خاک سے اٹھے ہیں وہ خواہی معافی جن کیلئے ہر بھر پر آشوب ہے پایاب علاوہ ازین اقبال کے آخری دور کا اردو کلام جو ارمغانِ حجاز کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بھی "ملا زادہ صیغہ لال کشمیر کا بیاض" کے زیر عنوان نظم شامل ہے جس میں کشمیر کے حسن کی تعریف کی گئی ہے۔ اس لئے ہمالہ سے خاک ہند کا جو مقدس تصور اقبال کی شاعری میں ابھرتا ہے وہ آخری زمانے تک اسی آبِ ناب کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال ہندوستان کا شاعر ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اقبال نے نرائن پور، علی گڑھ، ممبئی، حیدرآباد میں ۴

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ تصور کسی عصبیت کی بنا پر نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے آٹھ چل کر پاکستان کا نظریہ پیش کیا اور جناح کو اس امر پر آگاہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے قیام کی جدوجہد کریں۔ خود اقبال نے بھی اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اپنے نظریہ کو عام کرنے کی مکنہ کوشش کی، اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ یہاں اقبال کی دورہر ہی حیثیت بنانے آتی ہے۔

ایک طرف تو اقبال نے ہندوستان سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی تقسیم کا نقطہ نظر پیش کیا۔ اقبال کے ہاں جو تبدیلی آئی وہ محض سیاسی تھی۔ وہ شاعر تو تھے لیکن ایسے نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ سیاست دان بھی تھے۔ خود جناح بھی کسی زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر کہلاتے تھے۔ لیکن آگے چلکر یہی جناح مسلمانوں کے قائد اعظم کہلائے۔ جناح اور اقبال نے پاکستان کے قیام کے لئے جو جدوجہد کرتے رہے اس کے جواز اور عدم جواز سے مودخ ہی بحث کر سکتا ہے۔ میرے یہاں کہنے کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ اس زمانے کے سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ ملک کی تقسیم ناگزیر قرار پائی۔ چنانچہ خود ہندوستانی قائدین نے بھی بادل ناخواستہ اس تقسیم کو تقدیر کا نوشتہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس نے میرے خیال میں مدبر اقبال کو شاعر اقبال سے غلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اقبال نے شعری سطح پر نہیں بھی نعرہ پاکستان بلند نہیں کیا۔ اگر وہ ترانہ ملی لکھتے ہیں تو اس کے پس منظر میں پاکستان کا نظریہ نہیں بلکہ وطنیت کا وہ تصور ہے جو سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور مختصر یہ کہ انسانی نقطہ نظر سے غیر فطری نظر آتا ہے اور یہاں اقبال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر ہدف ملامت بنایا ہے۔

اس دور میں میں نے اور ہے جام اور گم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا لکھن ہے

اقبال نے اسلامی نقطہ نظر سے وطنیت کی سیخ کرتے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ۹

ہو قید تعالیٰ تو نتیجہ ہے تباہی رہ بھر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الہی دے تو بھی بنوت کی صدا پہ گواہی
گفتا و سیاست میں وطن اور سی کچھ ہے
اور شاد بنوت میں وطن اور سی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت اسی سے تسخیر ہے معذور تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے یہ تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بنتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ گنتی ہے اس سے

وطنیت کا یہ تصور غیر مسلموں میں ہی نہیں بلکہ پان عرب ازم کی صورت میں
خود مسلمانوں میں بھی موجود تھا۔ اور یہ بات قرآنی نقطہ نظر سے انتہائی
گمراہ کن ہے۔ اس لئے اس کی تکذیب اقبال نے ضروری سمجھی۔ اب اگر ہم
ترانہ ملی کا مطالعہ کریں گے تو اقبال کے اصلی نشاء کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں
اور یہ غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی ہے کہ ترانہ ہندی کے بعد ترانہ ملی لکھ کر اقبال
نے خود اپنی تردید کی ہے۔ یا یہ کہ اقبال نے ہندوستانی وطنیت سے دست برداری
اختیار کی اور یہ کہ اقبال نے مسلمانوں میں تنفر کے جذبات پیدا کئے۔ یہ سارے
الزامات محض مفروضہ کے نتیجہ ہیں۔ ورنہ حقیقت اس سے سراسر مختلف ہے
اصل میں وہ وطن پرستی سے مسلمانوں کو نجات دلانا چاہتے تھے جو بین الاقوامی
سطح پر ایک "خدا" کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جسکا لازمی اثر مسلمانوں
پر بھی پڑ رہا تھا۔ اقبال کے لئے سنت ابراہیمی کی تکیں ضروری تھیں۔ چنانچہ

اسی سنت کی تکمیل میں انہوں نے ترانہ نبویؐ مسلمانوں کو سنایا ۴
 دینا کے بتکدروں میں پھلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاس ہیں وہ پاس ہمارا
 سالار کارواں ہے میرے چارۂ اپنا اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
 اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

ادریہ کارواں کن کن منزلوں سے ہو کر گذرے گا ؟ ۴

تو بھی بے رہگذر میں سے قید مقام سے گذر

مہر و مجاز سے گذر پاس و شام سے گذر

اصل میں رنگ و نس، ذات پات اور وطن کے خلاف اسلام نے آواز اٹھایا
 حق اور سارے ہی انسانوں کو ایک اللہ کی مخلوق اور ایک آدم کی اولاد قرار
 دیکر رشتہ اخوت اور بھائی چارگی کو استوار کیا تھا۔ بھلا ایسے میں اقبال کو
 یہ کیسا گوارا ہوتا کہ مسلمان رنگ و نس اور وطن کے جذبات کے تابع ہو کر
 منتشر ہو جائیں۔ اقبال نے وطنیت کے جذبہ کی جو نفی کی ہے وہ مقامی
 حیثیت سے نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی حیثیت سے کی ہے۔ اور یہاں ملت
 اسلامیہ مراد کسی ایک ذات یا نسل کا اتحاد نہیں بلکہ تمام انسانوں کا نقطہ
 اتحاد ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھ کر
 ایک ملت گیتی نورد پیدا کر دی ہے ۴

حکمتش یک ملت گیتی نورد برا میں کلمہ تیر کو د

بر خلاف اس کے ۴

جو کرے گا امتیاز رنگ و خون مٹ جائے گا۔

ترکِ خوگا ہی ہو یا اعلیٰ والا گہر

مرد اصل اقبال نے کئی بنی نوع انسان کو وحدت انسانی کی دعوت دکا ہے۔
 اس نے میرے خیال میں اقبال کو ہندوستان یا پاکستان میں تقسیم کرنے کے بجائے
 آفاق میں ڈھونڈنا چاہیے۔ خود اقبال نے بھی شاید اپنے بارے میں کہا ہے ۴
 نہ صینی عربی وہ نہ رومی و شامی سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

اقبال کے وحدت انسانی کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے میں یہاں ان کی
 نظم جگنو کو پیش کروں گا۔ خصوصاً جگنو کا آخری بند بڑا معنی خیز ہے ملاحظہ ہو ۵
 حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انسان میں وہ سخن ہے غنچہ وہ چمک ہے
 یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا واں چاندنی ہے جو کچھ پس دردی لککے
 انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں درد غنچہ ہے بوئے بلبل، بو بھول کی چمک ہے
 کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز محفی جگنو میں جو چمک ہے وہ بھول میں چمک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں منہگاموں کا محل ہو؟

ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال انسانی وحدت اور یکتائی میں یقین رکھتے ہیں اس نے اقبال
 کو جزائیاتی حدود میں مقید کرنے کی کوشش بیکار محض ہے۔ اقبال کی
 تلاش ہندوستان یا پاکستان میں نہیں۔ بلکہ اس مرد آفاق کو
 کائنات کی دستوں میں تلاش کرنا چاہیے۔



جاوید اقبال

اقبال شاعر نہیں تھے، فلسفی بھی نہیں، وہ معلم نہیں تھے مورخ بھی نہیں اور وہ مدبر بھی نہیں تھے اور رہنما بھی نہیں۔ اصل میں وہ رازدارانوں میخانہ تھے۔ وہ، وہ تھے جس کی نگاہ سے فرشتے کسیر کا نسخہ چھپاتے پھرتے تھے۔ وہ کیمیا گر تھے، اور انہوں نے ایک ایسا نسخہ تیار لیا تھا جو اسم اعظم سے زیادہ اثر رکھتا تھا، اور جس کا نام محبت تجویز ہوا تھا، اور یہی محبت اقبال تھا بھی اور اقبال کی تمام تر شاعری کا محور اور مرکز رہی ہے اسی محبت کے جذبہ کو بے پایاں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی جذبہ کو عام کرنے کیلئے انہوں نے شعر لکھے ہیں۔ ورنہ ان کا مقصد شاعری کبھی بھی نہیں رہا۔

نسخہ محبت جب دریافت ہوا تو فرشتوں نے کیا کیا
ہوش نے یہ پانی مٹیٰ نو خیز یہ پھر کا گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کار عالم سے
ہوئی جنش یہاں ذروں نے مطلق ہو کر چھوڑ گئے ملنے لگے اللہ اٹھ سے اپنے اپنے بہم سے

خرام تاز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چنگ غنچوں نے پانی داغ پائے لالہ زاروں نے

مختصر یہ کہ کائنات کی رنگارنگی اسی محبت کے دم سے ہے۔ خود کائنات کی تخلیق اسی محبت کا نتیجہ قرار پائی ہے۔ اس نے اقبال نے اپنی شاعری کا مرکز اسی محبت کو قرار دیا، اور آپ جانتے ہیں اقبال کو یہ نسخہ محبت کہاں سے ہاتھ لگا۔ انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں اور اس کے بعد بھی مشرق و مغرب کی دورس گاہوں میں اس کی تلاش کی مگر یہ کوششیں رایگاں گئی۔ انہوں نے دنیا کے بڑے فلسفیوں اور نامور سیاست دانوں کی حکیمانہ باتیں سنیں لیکن بے فیض

ثابت ہوئیں۔ اقبالؔ ان معنوں میں پیدائشی مسلمان ہیں مگر انہوں نے ایک مسلمان کے گھر جنم لیا، لیکن اقبالؔ نے ذہنی اور قلبی سطح پر اسلام قبول کیا اور تمام عمر کی تلاش و جستجو کے بعد ایک کبلی پوشؔ کی زینہیں میں سے نسوۃ حیات ان کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ اقبالؔ نے ذات رسالتؐ اور اسلام کو اپنی شاعری کا خزانہ بنایا۔ کلام اقبالؔ کا مطالعہ اور اس کی تعبیر و تفسیر قرآن کو پڑھنے اور ذات رسالتؐ کو سمجھنے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اقبالؔ کی شاعری قرآن و حدیث کی منظوم تفسیر ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ قرآن نے جس آدمؑ کی تخلیق کی تھی اور جابلے کے پہکانے میں زمین کی فضاؤں میں کھو گیا اور جو وقت کے گزرنے کے بعد رسول عربیؐ کی صورت اپنی جھلک دکھا کر پھر غائب ہو گیا۔ اس آدمؑ کی تلاش اقبالؔ کا عین مشا ہے۔ اصل میں وہ اپنی شاعری کے ذریعہ اسی آدمؑ گم شدہ کی تلاش کرتے ہیں اور وہ اپنی شاعری کے ذریعہ اسی آدمؑ کی تعمیر اور تخلیق بھی کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری کا اگر ہم اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں۔ تو ان کے پیام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور اس طرح ہر سم اقبالؔ کی صحیح دریافت بھی ہو سکتی ہے۔ میں اپنی بات کی وضاحت کیلئے یہاں جاوید اقبالؔ کی مثال پیش کر دیتا ہوں۔

جاوید اقبالؔ بلاشبہ اپنے والد علامہ اقبالؔ کے فرزند و لبند رہے ہیں۔ لیکن جاوید اقبالؔ ایک حقیقت ہوتے ہوئے بھی تھوڑی حقیقت رکھتے ہیں۔ اقبالؔ نے جاوید کی پیدائش سے قبل ہی اپنے آدمؑ گم شدہ جیسے آپ اقبالیات میں "مرد مومن" کا نام دیتے ہیں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ لیکن ان کا یہ عمل عمومی تھا۔ چنانچہ ان کے مخاطب ان کی کوئی اولاد نہیں بلکہ عام بچے تھے۔ ان عام بچوں کیلئے اقبالؔ نے بلکہ درمیان میں جو کچھ لکھا وہی جاوید کے پیدا ہونے کے بعد

بال جبریل میں بھی جاوید سے راست مخاطب ہو کر کہا۔ اس کے ثبوت میں بچے
کی دعا، ہمدردی اور ایک آرزو جی اولین نظیوں پیش کی جاسکتی ہیں ۴
لب پہ آتی ہے رعابن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا سیریا
ہمدرد کام غریبوں کی کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

۵
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے
ایک آرزو میں وہ کہتے ہیں ۵

ہر درد مند دل کو رونا مرا ولادے
بے ہوش جو پڑے ہی شاید اپنی جگہ سے

گویا اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے سے ہی بچوں کی ایک خاص
افذا سے تربیت کرنا چاہتے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ آگے چل کر اپنی بچوں
سے کچھ بڑے کام لیں، ایسے کام جن کی ادائیگی کیلئے آدم کی تخلیق ہوئی ہے۔
اقبال نے اس "بچہ" کو شاہین کا نام دیا ہے، اور شاہین سے متعلق بے شمار
اشعار ہم کو اقبال کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ اقبال کا یہی غور آگے چلکر مردوں
کہلاتا ہے۔ شاہین سے "مردوں" تک کا یہ سفر تعلیم و تربیت کی مختلف منزلوں
سے ہو کر گذرتا ہے۔ اقبال نے مردوں کا جو تصویر پیش کیا ہے، اور جس انداز میں
اس کی تربیت کی ہے، اس کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اقبال کے تعلیمی نقطہ نظر
کو بھی سمجھیں۔ دراصل اقبال کی شاعری میں مردوں کی تعلیم کا ایک جامع نظام
ملتا ہے۔ بد قسمتی سے آج تک بھی عملاً اس کی تدوین ممکن نہ ہو سکی۔

لیکن اقبال کو خود اپنے افکار و خیالات کی روشنی میں ایسے نوجوان کی تعلیم و تربیت کا موقع ہاتھ آیا، اور خوش قسمتی سے حقیقت کی دینیا میں خود ان کا فرزند جاوید اقبال تھا۔ یہاں پھر جاوید اقبال کی ذات حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ تجرباتی بھی بن جاتی ہے۔ اقبال نے مرد مومن کی جستجو میں بچوں کی جس انداز میں تربیت کرنی چاہی، اس کا اندازہ جاوید کے تعلق سے ان کے رویہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اقبال گفتار ہی کے ہیں کردار کے بجا غازی تھے۔ خود کلام کی روشنی میں ہم ان کی ذات کا تجزیہ کریں تو یہ روشن حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انہوں نے وہی باتیں اپنے شعر میں کہنے کی کوشش کی ہیں جن پر وہ بڑی حد تک عامل تھے یا پھر یہ کہ وہ ایسی خواہش رکھتے تھے، علاوہ ازیں انہوں نے اپنے املاک کی روشنی میں جاوید کی تربیت کرنے کی کوشش کی۔

اقبال کی تین اولادیں تھیں۔ آفتاب اقبال، جاوید اقبال اور منیرہ لیکن تینوں میں جاوید اقبال ان کی آنکھوں کا تارہ تھے۔ ان سے محبت کچھ اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ جاوید ابھی گیارہ سال ہی گئے تھے کہ اقبال کی بیوی اور جاوید کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ عبدالسلام ندوی نے اقبال کا لڑکپن لکھا ہے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ڈاکٹر اقبال کو ایک استاد دینی کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے دیگر خصوصیات کے علاوہ یہ خوبی بھی ہو کہ وہ بچوں کو قرآن اور ادب پڑھا سکے اور ان کی اخلاقی اور دینی تربیت و نگہداشت کرے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑا تک و دو کی۔ ان واقعات کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو جاوید سے کتنی محبت تھی۔ یہ محبت محض اس وجہ سے نہیں تھی کہ جاوید ان کے بیٹے تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ چاہتے تھے کہ جاوید کی تربیت خود ان کے انداز فکر کی روشنی میں ہو۔ اس طرح جاوید ان کی شاعری کا

موضوع بن گئے۔ حقیقی و تصوراتی۔

جاوید اقبال کے نام بال جبریل میں نظمیں اور فریاد کلیم میں ایک نظم شامل ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اقبال کا آخری شعری کارنامہ جاوید نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کارنامہ اقبال کی فکری تشکیلات کا اعلیٰ نمونہ ہے اور شاعر کی حیثیت رکھتا ہے۔ گو جاوید نامہ اصل میں معراج نامہ ہے لیکن آخر میں وہ راست طور پر جاوید سے بھی مخاطب ہے۔ جاوید نامہ کے آخری اشعار ایسے ہیں جو نصیحت آمیز ہیں جس میں جاوید کو اپنی پوری شاعرانہ تعلیمات کا خلاصہ سمجھایا جائے۔

بال جبریل میں شامل جاوید کے نام جو پہلی نظم شامل ہے اس میں اقبال نے جاوید کو مخاطب ہو کر کہا ہے کہ عمر جاوید کا سراغ خودی کے ساز میں ہے، خودی کے سوز سے امتوں کے چراغ روشن ہیں (یہ ایک بات اہم ہے کہ آدم صاحب مقصود ہے کیونکہ وہ اپنے میں بے پناہ وسعت رکھتا ہے اور ترقی کی اعلیٰ منتہی بھی)۔ اقبال کہتا ہے کہ زاغ صحبت شاہین کی وجہ سے بلند پرواز تو نہ بن سکا، لیکن شاہین نے اس کی صحبت کے نتیجہ میں اپنی قوت کھودی۔ اقبال جاوید سے نصیحتاً کہتے ہیں کہ زمانہ کی آنکھ سے حیا نہ چکی ہے۔ اس لئے ایسے ماحول میں خود کے کردار کی وہ حفاظت کریں۔ اس نظم میں اقبال نے جاوید پر خودی کی اہمیت آشکار کرنے اور بری صحبتوں سے محفوظ رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایک اور نظم جو لندن میں اس کے لکھا ہوا پہلا خط آنے پر اقبال نے لکھی تھی، وہ اس وجہ سے زیادہ اہم ہے کہ اقبال اس میں راست طور پر جاوید سے مخاطب ہیں، اور نصیحت کا انداز واضح ہے۔ اس نظم میں اقبال جاوید سے کہتے ہیں کہ دیار عشق میں تم اپنا مقام پیدا کرو، نیاز زمانہ

نئے صبح و شام پیدا کرو۔ خدا اگر دل فطرت شناس دے تو سکوت لالہ و گل سے
کلام پیدا کرو۔ اقبال جاوید سے کہتے ہیں کہ فرنگی تہذیب کو اختیار کرنے کے
بجائے سفال ہند سے مینا و جام پیدا کرو اور آخر میں وہ کہتے ہیں کہ مرا طریق
امیری، نہیں فیری ہے۔ اس لئے خودی کو نہ بیچ اور غریبی میں نام پیدا کرو۔

جاوید کے نام تیسری اور اہم نظم ضرب کلیم میں شامل ہے۔ یہ
نظم قدرے طویل ہے اور معنوی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ اس نظم میں اقبال
نے زمانے کی برائیوں اور خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور واضح طور پر دین
پر قائم رہنے کی تلقین و ہدایت کی ہے اور اس بات کا احساس بھی دلا رہے
ہیں کہ ۴ جس گھر کا نگر چراغ ہے تو ہے اسکا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف تعلیم ہو اگر فرنگ آئے

اقبال نے جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے فرق کو واضح کیا ہے اور جاوید اقبال
سے کہا کہ اگر تم جدید تعلیم حاصل کرو تو اس میں حرج نہیں، لیکن مغربی تہذیب
سے اجتناب برتو۔ کیونکہ یہ تہذیب تنگ انانیت ہے۔ اس نظم کے مطالعہ
سے اقبال کے اُن نظریوں کی بھی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ جو مغربی علوم اور
مغربی تہذیب سے متعلق ہیں۔ اقبال دراصل روشن دماغ شاعر تھے اور
انہوں نے کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغربی انداز کی تعلیم
کے بغیر مسلمان زمانہ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن انہوں
نے سرسید کی طرح مغربی طرز کی پیروی کو لازم قرار نہیں دیا۔ اصل میں وہ
شبلی کی میاں رومی کو پسند کرنے والے تھے۔ وہ خود بھی لندن کے تعلیم یافتہ
تھے اور سوٹ پیسے تھے لیکن اس ظاہر کا بادل دے نے ان کی روحانی قوت
کو مغلوب نہ کر سکا۔ وہ بقیادہ کی طور پر فقیر تھے ایک ایسے فقیر جو اسرار

جہانگیری کو کھوتا ہے ، جو اپنے خاصیت اکسیر کی کھتی ہے اود جو میر اسٹ
مسلمان بھی ہے اور سرمایہ شبیری بھی ۔ اس لئے وہ جاوید سے مخاطب ہو کر
کہتے ہیں ۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خود می نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر

جاوید اقبال کے لئے یہ نصیحت اس لئے بھی ضروری تھی کہ نئی نسل نئی تعلیم
نئی تہذیب کے زیر اثر اسلامی تہذیب سے دور ہوتی جا رہی تھی چنانچہ اپنے
ان احکامات کا اظہار انہوں نے عمومی طور پر " ایک نوجوان کے نام " اپنی
ایک دوسری نظم میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

ترے صوفے ہیں افرنکی ، ترے قالین ہیں ایرانی
ہو عجیب کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا ، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور رعیدری تجھ میں نہ استغنائے مسلمانی
نہ ڈھونڈ اس چینر کو تہذیب حاصر کی تھلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں محراب مسلمانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے نوجوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منہر آسمانوں میں
نہ ہو نہ امید ، نو میری زوالِ علم و عرفان ہے
امید مرد میدان ہے خدا کے راز دانوں میں
نہیں تیرا نشین و سرسلطانی کی گنبد پر

تو شاہین ہے بیرا کر پیازوں کی پٹانوں میں
اقبال نے اپنی شاعری میں جاوید سے خاص طور پر اور نوجوانوں عام طور پر

جو باتیں کہی ہیں، اُن پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم کو نوجوانوں کے لئے ضروری تو سمجھا۔ لیکن مغربی تہذیب کی نفی کی ہے، اس کے برخلاف انہوں نے اسلامی تعلیمات کو مسلم نوجوانوں کیلئے لازمی و ضروری قرار دیا۔ ان کے کلام میں خودی، فقر، غریبی، استغنا اور عشق پر زور دیا گیا ہے۔ یہہ ایسے عناصر ہیں جن کے بغیر فرد کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ اور پھر اقبال تو مرد مومن کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جس کے ہاتھ میں زمانے کا مقدر ہوتا ہے۔ اس لئے بھی انہوں نے جاوید کو بار بار مغرب سے حذر کرنے اور اسلامی غنا اور فقر کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور جب وہ جاوید کو نمازیں پڑھتے دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں ۴

چہ می خواہی ازیں مرد تن آسائے بہر بادے کہ آمد رفت از جائے
سحر جاوید را در سجده دیدم بہ محبت چہرہ شہم بیارائے
گو اقبال نے اپنے فرزند کو راست مخاطب کیا ہے، لیکن اُن کا مخاطب ہر
دور کے نوجوان ہیں۔

فیض یہ کس کے نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کہ بے جس کی نگہ میں شعاع آفتاب

سیاست

اقبال جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ مختلف انقلابات سے دوچار تھا خود ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرسید احمد خاں اور واجد رام موہن رائے نے جو تعلیمی تحریک وسط اُسویں صدی میں شروع کی تھی وہ اب سیاسی میدان میں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی۔ کانگریس دیے دیے سے اچھے ہیں موراج کا لغو بلند کر رہی تھی، اور اقبال نے جس زمانے میں شعر کہنا شروع کیا، وہ دور تو ہندوستانی قومیت اور تحریک آزادی کا لفظ عروج تھا اسی زمانے میں یعنی بیسویں صدی کے پہلے سال ہی اقبال نے لاہور سے اپنی آواز بلند کی اور یہ آواز ”ہمالیہ“ کے زیر عنوان بلند ہوئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستانیوں کی دل کی آواز بن گئی۔ اس نظم کو ہماری قومی زندگی میں وہی مقام حاصل ہوا جو خود کوہ ہمالیہ کو حاصل تھا۔ یعنی اقبال کے ابتدائی زمانے کی یہ نظم ہندوستانی قوم کی ترجمان بھی ہے اور نگہبان بن گئی ہے۔

اے ہمالہ! داستانِ اس وقت کی کوئی شا
مسکنِ آبائے انسان جب بنادامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داع جس پر غارِ رنگِ ٹھلک کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے نقور پھر وہ صبح و شام

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اقبال نے جب گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑنے کہا تو ان کا مقصد ماضی پرستی نہیں تھا۔ بلکہ وہ آزادی کے دن تھے جسے ہندوستانی قوم تاریخ کے المیہ کے نتیجے میں کھو چکی تھی اور جو ۱۸۵۷ء میں غدر کے نام سے ظاہر ہوا تھا۔ اس طرح نظم ”ہمالیہ“ سے اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں سیاسی افکار

و ادکار کا اظہار کا ذکر کر دیا تھا۔ اور سیاست سے اُن کی یہ دلچسپی، زمانہ آخر تک برقرار رہی تھی، کیونکہ وہ حالات اقبال کی موت تک باقی تھے۔ جن کے مجبور کرنے پر اقبال نے سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ملک تو اُن کے انتقال کے تقریباً دس سال بعد آزاد ہوا۔ وقت کی یہ عجیب قسم ظریفی یہی کہ وہ بلبل خوش نوا جس نے ملک کی آزادی کے ترانے الاپے اور جو ملک کی آزادی کیلئے ترپتا پھڑکتا رہا، ملک کے آزادی کی خوشی گوارہ واقعہ کے ظہور پر تیرہوے وقت ہم میں موجوں نہیں تھا۔

اقبال نے بہالہ کے بعد کئی ایک نظمیں لکھیں۔ چنانچہ بانگ درا کی نظموں میں پرندے کی فریاد، صدائے درد، سیدی لوح تربت، تراشہ مہندی، جگنو، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، سوالی رام تیرتھ طلباء علی گڑھ کالج کے نام، ترانہ ملی، وطنیت، رام، نانک، پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ، اسیری، سرمایہ و محنت، دنیا سے اسلام اور طلوع اسلام خاضی اہم نظمیں ہیں جن کا مطالعہ اقبال کے اس ذہنی سفر کی نشاندہی کرتا ہے جو اقبال نے ابتدائی زمانہ میں طے کیا تھا۔ اقبال اپنے اسی میں جب کہ وہ ابھی لندن ہو نہیں آئے تھے۔ ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر تھے اور وطنیت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ لیکن جب انہیں مغربی ممالک کے دورہ کرنے اور مغربی سامراج کی چالوں کو قریب سے دیکھنے کا ملا تو ان کے سیاسی عقائد میں تیزی سے تبدیلی آئی شروع ہوئی، بعد انہوں نے قومیت اور وطنیت کے نظموں کی بانگ دہلی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ میری اس بات کی تائید ان کی نظموں ترانہ مہندی، ہندوستانی، بچوں کا گیت یا رام نانک اور سوالی رام تیرتھ جیسی قوم پرستانہ نظموں سے ہوتی ہے۔ نیا شوالہ

توانقلابی نظم تھی، جس نے قوم کے ایک بڑے طبقہ کو بہت متاثر کیا۔ لیکن اقبال نے لندن سے واپسی کے بعد خالص وطن دوستی کے جذبہ پر ضرب کاری لگائی ہے اور اقبال کی یہ ذہنی تبدیلی کچھ یوں ہی نہیں تھی، یا یہ کہ کسی تعصب کا نتیجہ بھی نہیں تھی، اور یہ سمجھنا کہ اقبال نے ترانہ ملی نکھ کر ترانہ ہندی کی تردید کی ہے سیاسی سوچ بوجھ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اصل میں ترانہ ملی اقبال کی پہلی نظم ترانہ ہندی کا تسلسل ہی ہے، یہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں یہاں کوئی چوڑا دینے والی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کا جو ذہنی سفر ہے یا یہ کہ فکر اقبال کا جو تسلسل ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں خلیفہ عبدالحکیم کی مدد سے اپنی بات واضح کروں گا۔

جب وہ (اقبال) یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیے اور اس کے گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیے تو اس سے اس کی مراد غلط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے۔ جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے موطنوں کو وطنیت کے اس جذبہ کی طرف لانا چاہتا تھا، جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروج انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو، ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبہ وطنیت نہیں ہے، لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے اپنی آواز بلند کی۔ "اقبال نے اپنے اس نقطہ نظر کو "وطنیت میں یوں ظاہر کیا ہے کہ اس دور میں ہے اور ہے جام اور ہے جم اور ساتی نے بنا کی روش و طغ و ستم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور ان تازہ صداؤں میں براصبا سے وطن ہے جو پیر بن اس کا ہے وہ مذہب کا کئی ہے

اقبال کے خیال میں وطن ایک خدا کی صورت جب اختیار کر لیتا ہے ۹

اقوام میں مخلوق خدا بنتی ہے اس سے

علاوہ انہیں اقوام جہاں مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، وہیں سیاست کا مگر صداقت سے خالی ہو جاتا ہے اور کمزور کا گھر غارت ہوتا ہے۔ یہ تو عمومی حیثیت سے ہوا۔ خصوصی طور پر مسلمانوں کیلئے بھی وطنیت کا یہ جذبہ گھائے کا سودا تھا کیونکہ بقول اقبال تہذیب نوری کا تراشیدہ یہ بت غارت گر کا شانہ بنی تھا اس کی وجہ سے توحید کے قوی بازو کوٹ جاتے تھے اور سنت رسولِ صلعم کے یہ مغائر بھی تھا۔ اسلئے انہوں نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا ۹

گفتار سیاست میں وطن اور کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال نے وطنیت کے جذبہ سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی متفرک کیا، کیونکہ مغرب میں جس قسم کا تصور پایا جاتا ہے، وہ مساوات اور آزادی جیسے اعلیٰ اقدار کے خلاف ایک مخاد نظر آتا ہے، اس کے نتیجے میں نسل پرستی اور محدود قومیت کے تصورات کو مدد ملتی ہے۔ اقبال اصل میں آزادی، اخوت اور مساوات انسانی میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا نظریہ ان مہنوں میں عالمی آفاقی اور ہمہ گیر تھا کہ گلستان کے سبھی پھول کو کھلتا، ہلکا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بیو اور جینے دو کے اصول کے قائل تھے۔ پناہ ان کے خیالات کی جھلک ہیں ان کی ابتدائی نظموں مثلاً جگنو اور پرند کی فریاد جیسی نظموں میں نظر آتی ہے۔ پرندے کی فریاد میں جو تڑپ اپنے چچی اور اضطرابی کیفیت جو پرندہ کی اندر ہے، وہ غلامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اقبال چاہتے تھے کہ ہندوستانی قوم مل بھی یہ تڑپ کہہ دیتی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو۔ اور جب پرندہ اپنی

امہان کی عقلی نظر جلد ہی اس چمکدار شے کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی دیکھ سیتی ہے وہ واپس ہٹتا ہے اور کہیں پناہ لیتی ہے تو صرف اسلام کی پناہ گاہ میں اقبال نے اسلام کو اس کی حقیقی صورت میں قبول کیا ہے۔ اس لئے قدم قدم پر وہ اس سے رہبری حاصل کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اس دور کے مسلمان خود بھی اسلام سے دور تھے اور صرف رسوم کو اسلام سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی یہ کج فہمی اقبال کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ خصوصاً منبر و محراب کے اجارہ داری اور کوتاہ اندیشی کے تعلق سے اقبال نے کھری کھری باتیں سنائی ہیں پناہ دہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی چوٹ کرتے ہیں ۴

حق را بسجودے ضماں را بطوائفے بہتر ہے چراغ حرم و دیر کجباد و
اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

رہ رسم حرم نامحرمانہ کلیا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیر سن چا نہیں اہل بیتوں کا یہ زمانہ

مذہبی ٹھیکیداروں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ۴

دور حاضر ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم اہل سجادہ ہیں اہل سیاست ہیں امام
اسمیں پیری کی کرامت آئے میری کار زور سیکڑوں صدیوں کے خوگر میں غلامی کے علوم

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی

پختہ ہو جاتے ہیں خوئے غلامی میں غلام

اقبال نے وطنیت کے علاوہ جن باتوں کو توڑا ہے ان میں جمہوریت، سرمایہ داری، کمیونیزم اور لادین سیاست جیسے بہت بھی شامل ہیں۔ جو اس دور کا مقدور بن گئے ہیں۔ جمہوریت دور جدید کا مقدر بن گئی ہے۔ لیکن ان فی تقدیر کا میر عجیب المیہ ہے کہ وہ تباہی سے بچنے کیلئے دوسری تباہی کو مول لیتا ہے۔ شاہی

ہیں آرزو کا اظہار کرتا ہے ۴

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دے

تو یہ آرزو کسی پرندے کی نہیں خود ہندوستانی قوم کی ہے، اقبال کی ہے یہاں اقبال کا لہجہ بہت ہی بکھا بکھا ہے۔ یہاں وہ آزادی کی آرزو کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا، اور جوں جوں انگریز سامراج کا ظلم بڑھتا گیا۔ آزادی کی آرزو آتش بدماں ہوتی گئی، اور اقبال کا یہی نرم لہجہ، انقلابی گونج کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۵

اٹھو سیری دنیا کے غریبوں کو جگادو

کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

اور جیتِ آداب جنوں، شاعرِ مشرق سیکھ لیتا ہے تو ہندوستان کی تحریکِ آزادی بھی ایک نیا موڑ اختیار کر لیتی ہے۔

اقبال کے سیاسی افکار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف ”وطنیت“ کے تصور ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس دور کے جو مغربی و مشرقی سیاسی نظریے تھے ان کی بھی نفی کی ہے۔ لیکن ایسا کرینے سے ایک دانشور کی حیثیت سے انہوں نے اقوامِ عالم کے مختلف نظریوں کی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں پنوین، مسوینی، کارل مارکس اور لیٹن اس بات کا ثبوت ہیں۔ اقبال کا مطالعہ وسیع تھا، اور اس سے وسیع ان کا مشاہدہ تھا، اور خوبی یہ کہ اقبال کی نظر اسلام پر تھی، جو کائنات کا سب سے بڑا انقلابی نظریہ ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کا فکر کہیں بھٹکنے نہیں پاتا وہ ہر شے کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ اس کی آب و تاب سے متاثر ہوتے ہیں۔

کی جگہ جمہوریت نے ملے لی۔ جمہوریت کیا ہے ؟ اقبال کی زبانی سنئے۔

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں

مبندوں کو گنا گموتے ہیں تو لاہنچی کرتے

اقبال نے جمہوریت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور وہ گزرتے گئے

جمہوریت کے تجربہ سے اس وقت ہم گزرمسے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان

کا دمج میں آئے ۱۹۴۷ سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان چھیالیس برسوں میں ہندوپاک

کی سیاسی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہیں، خصوصاً پاکستان کا تلخ تجربہ آمریت

اور پاکستان کی تقسیم۔۔۔ کم از کم پاکستانی سیاست کے پیش نظر ہم نہیں

کہہ سکتے کہ جمہوریت کا تجربہ وہاں کبھی کامیاب بھی رہا ہے۔ برصغیر سے ہٹ کر

امریکہ، روس اور خصوصیت سے عرب و افریقہ کے اسلامی ممالک میں جہاں

جہاں جمہوریت کا نظام رائج ہے وہی تباہی مچا ہوئی ہے جو کبھی شاہوں کے

دور میں ہو ا کرتی تھی۔ سرمایہ دار ممالک میں انسانی نافرمانی کے واقعات

روزمرہ کی چیز ہیں۔ انسانیت جمہوریت کے ان بلند و بالا ایوانوں کے

زیر سایہ جاگ رہی ہے۔ اس لئے اقبال نے اس سرمایہ داری کے خلاف

آواز بلند کی، اس سلسلے کی نظم سرمایہ و محنت ہماری خصوصی توجہ چاہتی ہے ۴

آئینہ مزدور کو جا کر مر پیغام دے

خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیدر

شاخ آہو پر رہی صدیوں ملک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزدور کی ہوشیاری

اہل شروت جسے دیتے ہیں غریبوں کو زہمت

ساحل لوط نے تجھ کو دیا برگ حشیش

اور نوائے بے خبر بچھا اسے شلخ حیات

نسلی اقومیت، کلیا، سلطنت تجھ رنگ

خواجگی نے خوب جن جن کے بنائے مسکرات

کھانا سرائواں، خیالی دیوتاؤں کیلئے

شکر کی لذت میں تو کٹوا گی نقد حیات

نکر کی چالوں بازی نے کیا سرمایہ دار انتہائے سادگی کھا گئے مزدور مات
مزدور کو اسکی تباہی کا احساس دلانے کے بعد اقبال پھر مخاطب ہوتے ہیں ۴
انھو کے اب بزم جاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

گویا اقبال نے مزدورں کو، دعوت انقلاب دی، اور یہ دور مزدورں کے
انقلاب سے عبارت بھی تھا۔ فرانس میں جو تحریک روسو کی وجہ سے پندھویں
صدی میں شروع ہو چکی تھی زار کے زوال کے بعد اپنے انتہائی عروج کو پہنچ
چکی تھی۔ روس میں مزدور انقلاب کی کامیابی نے افسانیت کو ایک نیا سہارا دیا
تھا، اور طلوع اسلام کے بعد عالمی تاریخ کا یہ سب سے بڑا انقلاب تھا۔ جسے
اقبال نے بھی قبول کیا اور سین کو خدا کے حضور میں پیش کر دیا۔ یہ اقبال
کی آزادی سے محبت اور مغربی سامراجیت سے دشمنی کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے
مغرب کے خلاف برا آواز کو بیک کہا۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اقبال کے
پنوں اور سوینی کی پیٹھ ٹھونکی۔ یہاں اس توصیف سے اقبال کی مراد
بربریت کو بوا دینا نہیں بلکہ سامراجیت اور سرمایہ داری کو شکست فاش
دینا تھا۔ اصل میں یہ انتقامی جذبہ تھا۔ جس نے اقبال کو سوینی اور پنوں
کی تائید کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ سوینی کے زبان میں سرمایہ داروں سے سوال کرتے
ہیں ۴

بروہ متعذیب میں عاصت گری آدم کشی

کلی روار کھی تھی تم نے میں روار کھا ہوں آج

لیکن اقبال کا یہ معنی انداز فکر، ان کے سیاسی افکار کی بنیاد نہیں ہے۔ وہ جلد ہی
مزدور کے انداز چلہ بازی کو تار جاتے ہیں اور مزدوروں کی آڑ میں جوئی اہمیت
اور ہی تھی اس پر کسی حد تک غصہ لگاتے ہیں۔ چنانچہ کارل مارکس سے

آواز کے زیر عنوان لکھتے ہیں ۴

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
 نہیں ہے دنیا کو اب گواہ پرانے افکار کی نمائش
 تری کتابوں میں آئے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
 خطوط خمدار کی نمائش مرید و کجدار کی نمائش
 جہان مغرب کے تنکروں میں کلیاں میں مدرسوں میں
 ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقل عیار کی نمائش
 اور وہ پھر مایوس ہو کر اس انقلاب کے بارے میں فرماتے ہیں ۴
 نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و حیات
 خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال و نیا کے انکار سے مایوس ہو کر رجوع بہ درگاہ
 خداوندی ہوتے ہیں، اور صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں پورے اقوام عالم کے
 نجات کا ذریعہ انہیں صرف قرآن نظر آتا ہے۔ جو نہ مسلمان اس کتاب کے
 دعویدار ہیں، اس لئے اقبال کے پہلے مخاطب یہی ہیں۔ یہاں وہ محض
 کھلی تنگ نظری کی وجہ سے مسلمانوں سے مخاطب نہیں ہیں۔ اقبال کے خیال
 میں مسلمانوں کی اصلاح اقوام عالم کی اصلاح کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے
 وہ اشتراکیت کی بھی کھل کر مخالفت نہیں کرتے ان کے اس خیال کی وضاحت،
 سیاسیات مشرق و مغرب کے چند شعروں سے ہو سکتی ہے ۴

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
 اندیشہ بواشوخی ادا کا یہ جبسور
 بے سود بین روں کی یہ گرنی رقتار
 فرسودہ طیلقوں سے فنا نہ ہوا بینرار
 کھلے نظر آتے ہیں بدرجہ وہ اسرار
 ان کی ہوس جنہیں رکھا تھا چھپا کر

قرآن میں ہو غوط زن اسے مرد مسلمان اللہ کو ہے تجھ کو عطا جلت مگر داد

جو حرف قلی العفو میں پوشیدہ ہے اہلک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو موعودار

اس انداز کی دوسری نظموں میں "لا دین سیاست" بھی ایک نظم ہے جس سے انداز ہوتا ہے کہ اقبال مغربی سیاست اور مغربی تہذیب سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور انہیں انسانیت کی نجات صرف اسلام میں نظر آتی تھی۔ اقبال کے اس ذہنی سفر کا مطالعہ ہمیں کسی مذہبی عصیت اور تنگ نظری کے ساتھ نہیں، بلکہ سچائی کو قبول کرنے کے جذبہ کے ساتھ کرنا چاہیے۔ جس کے نتیجے میں یقیناً ہم ایک سچی اور سیدھی راہ کو اختیار کر سکیں گے، ورنہ انسانیت کے قافلے یوں ہی نور و ظلمت کی سنہروں سے گذرتے رہیں گے۔ ظلمت سے نکل نجات کی خواہش انہیں مزید تیار کیوں میں لے جایا کھینکے گی۔

اقبال کے اس نظریوں کی روشنی میں اگر ہم اقبال کی زندگی کا مطالعہ کریں، تو اندازہ ہو گا کہ وہ محض گفتگو کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ انہوں نے جس اسلامی سیاست کا تصور پیش کیا تھا۔ وہ سیاست اس سے بالکل ہی مختلف تھی۔ جس میں حصہ لینے کی انہیں دعوت دی جا رہی تھی۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ تا وقتیکہ پوری قوت سے افکار باطلہ کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ افکار صحیح کو پرورش پانے اور فروغ ہونے کا موقع نصیب نہ ہو گا۔ ہندوستانی سیاست میں یقیناً اقبال کو کوئی بڑا مقام نہ مل سکا، اس کی وجہ خود اقبال کی مصلحت پسندی تھی یا پھر خلیفہ عبدالمکرم کے الفاظ میں اقبال کی سلاطین طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ اس لالچ میں نہیں آئے جب امراد بڑھا تو اقبال نے جواباً کہا ۵

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر ہے کو ہیکٹ کہوں تم سے جو ہونا شذر راز

دُصیب مجھے عزم فسروغی لاہیں یلو کوئی

اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

حضرت انسان کی رات کو سحر کرنے کیلئے اقبال نے جہاں مغربی فکر اور مشرقی
فلسفہ کی تردید کی وہیں مسلمانوں کو وہیں خوب غفلت سے جگانے کی سعی مسلسل
جی کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں طلوع اسلام، مسلم اور یوزہ خلافت،
ہیپانہ، اے پیر حرم، مرد مسلمان اور امرائے عرب کے علاوہ شکوہ اور
جواب شکوہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اصل میں یہ نظمیں ان کی انتہائی تقویوں
مثلاً سلطان بیٹو کی وصیت کا تسلسل ہیں۔ جہاں اقبال نے مغربی تہذیب
فاد قلب و نظر قرار دیا، وہیں افراد فرنگ کو اولاد ابلیس قرار دیا ہے

تیسری حریف ہے یارب سیاست فرنگ

مگر ان کے لیے باری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے

بنائے خاک سے اسے دو ہزار ابلیس

جب اس ابلیس نے خاک سے دو ہزار ابلیس بنائے تو ان کے نام ایک
فرساں لگا جا رہا ہوا۔ جس میں خاص طور پر ہدایت تھی ہے

وہ فاقہ کش کو تے سے ڈرتا نہیں ذرا روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات اسلام کو حبد و بن سے نکال دو

انفائیروں کی غیرت دین کا گاہِ علاج ملّا کو ان کے کوہ و دین سے نکال دو

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز

ایسے غزل سر کو جن سے نکال دو

اقبال کی دور رس اور عقابانی نگاہوں نے ان سازشوں کو دیکھ لیا تھا۔ جو دین کے بڑے بڑے ممالک مسلمانوں کے خلاف پس پردہ کر رہے تھے۔ جہاں اقبال نے سیاست لادین کا پل کھول دیا اور جہاں افرنگی سیاست کی برائیوں کو کھول کھول کر بیان کی وہیں اس نے مسلمانوں سے بھی خطاب کیا۔ خصوصاً عربوں میں جو نا اتفاقی، پھوٹ، انتشار اور علاقائی عصیت پائی جاتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے مین الاقوامی اتحاد کے لئے ہمیشہ خطرہ بنی رہی۔ اقبال پان اسلام ازم کے قائل تھے اور بین الاقوامی ہر سطح پر پہلے اتحاد چاہتے تھے اور پھر اسی جمعیت اقوام کو جمعیت آدم میں بدلنا چاہتے تھے امرائے عرب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ۴

ہنیں وجود محدود و ثغور سے اس کا

محمد عربی سے بے عالم عربی

اس سلسلے کی نظموں میں جمعیت اقوام متحدہ دین و سیاست اور مکہ اور جینوا بھی کافی اہم نظمیں ہیں۔ مکہ اور جینوا میں وہ کہتے ہیں ۴

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام پوشیدہ نگاہوں سے رہی وصیت آدم تفریقِ مل حکمتِ افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود ملتِ آدم ملے نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم جمعیتِ اقوام سے جمعیتِ آدم میں بدلنے کا خواب اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ جینوا سے ان کوششوں کا مرکز بدل کر طہران کیا جائے ۴

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینوا

شاید کمرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

جینوا سے طہران کی یہ منتقلی محض مقامی نہیں نظر مانی ہے۔ یہ کسی تعصب کا نتیجہ نہیں تعصب کی سیخ کنی ہے۔ اقبال نے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ اسلام

کو ذہنی اور قلبی سطح پر قبول کیا ہے۔ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے ایک نظریہ حیات ہے جس کے ذریعہ انسانیت کی نجات ممکن ہے اور جس کی روشنی میں انسان انسان کو پہچان سکتا ہے۔ اسے احترام اور میت کا درس نہیں ملتا ہے۔ جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدم مٹی سے بنے تھے، اور تمام انسان اسی ایک آدم کی اولاد ہیں تو نہ صرف انسانی برادری کا تصور ابھرتا ہے بلکہ انسان کی فطرت میں خاکساری، عجز و انکساری کے جوہر بھی کھلتے ہیں۔ بقول سلیم چشتی ”بنی نوع آدم جسمانی اور دماغی دونوں پہلوں سے ترقی یافتہ ہو جائیں تو افراد یکتا کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں خلافت و نیابت الہیہ کی اہل ہوگی“ اقبال نے اسرارِ خودی میں لکھا ہے ”پیشے“ نے بھی اپنے تجسّس میں افراد یکتا کی اس ترقی یافتہ جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اس کے اتحاد اور نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔ اس لئے اقبال اپنی ملت پر اقوامِ مغرب سے قیاس نہیں کرتے، بلکہ ان کی نظر میں، رسولِ ہاشمیؐ کی تعلیمات زیادہ اہم ہیں، کیونکہ اقوامِ مغرب کی جمعیت کا انحصار ملک و مذہب پر ہے، جب کہ رسولِ ہاشمیؐ کی تعلیمات کے پیش نظر جمعیت کا انحصار مذہب پر ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اقبال مسلمانوں کو اتحادِ ملی کا درس دیتے ہیں ۵

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

۵

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجسَم بھی نہیں

اقبال کے نزدیک مذہب محض چند رسوم و روایات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔ اصل میں مذہب جمعیت آدم کی بنیاد ہے جس کا وہ خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اس لئے وہ مذہب پر زور دیتے ہیں اور مذہب اسلام کو اپنی شاعری کا پیام بننا کر جی نوع انسان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ "آج کل" کے حالیہ نمبر (نومبر ۱۹۶۶ء) میں کلیم الدین احمد اور فراق گورکھپوری کے دو انتہائی نزاعی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے دونوں ہی حضرات کی علمیت، قابلیت اور ذہنیت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ فراق گورکھپوری نے انسان اور حیوان کا تقابلی حین انداز سے زیر نظر اقتباس میں پیش کیا ہے، اسے میں بلا تبصرہ پیش کر رہا ہوں، تاکہ ان کی فکر کے بارے میں آپ خود کوئی رائے قائم کر سکیں۔

انسانی وحدت یا انسان کی سلامتی یا انسانوں میں باہمی تعاون کبھی اس امر پر مبنی یا منحصر نہیں رہا اور نہ قیامت تک اس امر پر مبنی اور منحصر ہو سکے گا کہ دنیا بھر کے انسان ایک خدا، ایک اوتار، ایک رسول، ایک الہامی کتاب، ایک ملت، ایک مذہب اور ایک رسم و رواج کو مانتے یا ایک کلمہ یا ایک کاشی کو مانتے۔ بیسویں صدی کی اہم تصنیفات میں شہرہ آفاق تحقیقی اور مفکر پرسنس کر دیا لیکن کی کتاب ہے، امداد باہمی Mutual Aid اس کتاب میں بتایا ہے کہ انسان کے پیدا ہونے کے کئی لاکھ برس پہلے سے آج تک صد ہا جانداروں اور کیمڑے مکوڑوں میں باہمی محبت یا باہمی امداد اور گہرے سے گہرا احساس وحدت کار فرما رہا ہے۔ اور آج تک ہے۔ اور قیامت تک رہے گا۔ کسی خدا، کسی رسول کسی الہامی کتاب کسی مذہب و ملت کی رہنمائی کی ذرا بھی ضرورت یا

یہاں بھر کے لئے بھی ضرورت ان جانداروں کو نہیں ہوتی، اور انہوں نے اپنی پوری آبادی میں صلح کر لی۔ چونٹیوں کی آبادی اربوں اور کھربوں کی تعداد تک پہنچتی ہے جو پھوس میں، طوطوں میں، بندروں میں اور جانوروں سے گذر کر وحشی ترین، انسانوں میں وحدت و محبت بغیر کسی ترجیح، حقیقت یا ملت کے راگ الاپنے والے کے قائم ہے۔

اب اس کو کیا کیجئے کہ ازل سے ابد تک انسانوں میں محبت اور اور وحدت قائم کرنے کیلئے ہر ملک میں اور ہر دور میں پیغمبر پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ پوری انسانیت کے لئے حضور اکرم صلعم مادی و رسول بنا کر بھیجے گئے۔ قرآن خود غور کریں کہ انسان ان جانداروں سے جن سے کہ وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کس حد تک بدتر یا بہتر ہے۔ میرا جہاں تک خیال ہے جتنے بھی پیغمبر پیدا ہوئے فراق کے نزدیک غیر فرور تھے۔ اب فراق صاحب سے کیا بحث کیجئے؟

کلیم الدین علیہ السلام "اقبال اور عالمی ادب" کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے یوں قسم طراز ہیں۔

"اقبال کی شاعری کا زیادہ سے زیادہ حصہ پیغام ہے۔ نرا پیغام ہے یا تعلیم ہے، خالص تعلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ عموماً پیغام کسی خاص فرقے کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن تعلیم کسی خاص وقت کے لئے موزوں ہوتی ہے یعنی اس میں وہ عالمگیری نہیں ہوتی، وہ پائیڈاری نہیں ہوتی، جو بزرگ شاعری میں ہوتی ہے۔"

بھلا بتلائے اس انداز فکر کو کیا کریں۔ اصل میں کلیم الدین احمد علیہ السلام کا ذہن محدود کا شکار ہے۔ وہ اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ پیام جہاں ایک فرقے کیلئے ہوتا ہے وہاں وہ پوری انسانیت کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ اور تعلیم جہاں کسی خاص وقت

کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ وہاں وہ ہر وقت کے لئے مفید و موزوں
 ہو سکتی ہے۔ اور انہوں نے جس "برزگ شاعری کی طرف اشارہ فرمایا ہے
 غالب ان کی اس سے مراد اُن کی بیانیہ نغیں ہیں !!۔ کلیم الدین احمد صاحب نے
 مغربی ادکار کے مطالعہ کے لئے جہاں عمر گزاری ہے کاشی ! وہ عمر عزیز کا ایک
 حصہ خود اسلام کو سمجھنے کے لئے وقف کئے ہوئے۔

اقبال نے اسلام کو ذہنی طور پر قبول کر کے اپنی افاقیت اور
 ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عالمی افکار اور جمیت اقوام پر
 پے در پے حملے کرتے ہیں۔ وہیں خود مسلمان بھی قربِ کلیمی سے بچ نہیں سکتے۔ اقبال
 نے جمیت اقوام کی تیغ کشی کی ہے۔ اور جمیتِ آدم کے تصور کو سیاسی سطح پر
 پیش کیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ عربوں کے اندر پائے جانی والی عصیت کو کیسے
 گوارا کر سکتے تھے۔ اگر وہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے کہتے ہیں ۹

ربط و ضبطِ ملت بیضا ہے ملت کی نجات
 ایشاءِ وائے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
 پھر سیاست چھوڑ کر داخلِ حصارِ دین میں ہو
 ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
 ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
 نیل کے ساحل سے بیکر تائب خاک کا شغور

تو وہ ہیں عربوں کو بھی ٹوکتے ہیں ۹

اگر نہ ہو امراءِ عرب کی بے ادبی
 وصالِ مصطفویٰ افتراقِ بُو بھی
 یہ نکتہ پہنچ سکا یا گیا کس اُمت کو
 نہیں وجودِ حدودِ شعو سے اس کا
 اگر نہ ہو امراءِ عرب کی بے ادبی
 وصالِ مصطفویٰ افتراقِ بُو بھی
 محمد عربیؐ ہے عالمِ عربی

اقبال نے برسوں پہلے جو نکتہ امرائے عرب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، وہ آج کے موجودہ حالات میں کتنا زیادہ اہم بن گیا ہے، قابل غور ہے یہی کیفیت عالم انسانیت کی ہے۔ اقبال کی بصیرت نے عالمی سیاست کی جو بنیاد فراہم کی ہے۔ وہ احترام آدمیت ہے اور یہی اصل تہذیب بھی ہے اور یہ جذبہ مذہب کے بغیر انسانوں میں پرورش نہیں پاسکتا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جائے چنگیزی

اقبال نے اس ہمہ گیر اور آفاقی نظریہ آدمیت کے پیش نظر اگر ہم انکی شاعری کا مطالعہ کریں تو اس شاعری کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اور پھر ہم اقبال پر محض مسلمانوں کی مبنوائی کا الزام نہیں لگاتے برخلاف اس کے اقبال نے بنی نوع انسان کی فلاح، ان کے اتحاد، ان کی خوشحالی اور آزادی

کا جو خواب دیکھا تھا اس کی حقیقت ہم پر روشن ہو جاتی ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیکھے ہیں انداز خسروانہ

ذات رسالت

اقبال نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ عارف ہے، مجدد ہے، محدث ہے یا کہ وہ فقیہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کلام اقبال میں معرفت، اجتہاد کے کثیر اور حدیث اور فقہ کے بعض مسائل موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ عارف نہیں تھے۔ لیکن معرفت کے رموز سے واقف تھے، وہ مجدد نہیں تھے لیکن اجتہاد کی اہمیت ان پر روشن تھی، وہ محمد بنی تھے لیکن حدیث پر ان کی نظر تھی، اور وہ فقیہ بھی نہیں تھے لیکن فقہ کے نکات ان پر آشکار تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ محرم راز درونِ میخانہ تھے؛ یا پھر اس لئے کہ

راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے

ہیں اس کی گفتگو کہ اندازِ محیر مانہ

اقبال راز درونِ میخانہ اور واقف راز حرم ہونے کی وجہ سے ان کا انداز گفتگو عوامانہ تھا۔ انہوں نے حدیث و فقہ اور معرفت و اجتہاد ہی پر کیا منحصر ہے زندگی کے ہر مسئلہ پر افکار خیال کیا، اور بے باکانہ انداز میں کیا ہے، اور ان کی یہ باکی عام انسانوں سے ہوتی تو اور بات ہوتی، بارگاہِ خداوندی میں کہتے ہیں تو لہجہ میں وہی سختی اور گرمی۔ شکوہ پڑھ لیجئے خود اندازہ ہو جائے گا۔

ہے بجا شیوہ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں، فریاد سے مہور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پر تو معذور ہیں ہم
اے خدا! شکوہ اربابِ وفا سن بھی لے

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ سن بھی لے

”شکوہ“ اور ”جواب شکوہ“ سے گذر کر جب ”بالِ جبریل“ تک پہنچتے ہیں تو یہاں کی

بڑھ کر گستاخی میں بدل جاتی ہے۔ کھنسنے کو تو غزل کا شعر ہے مگر اندازاً عافرانہ
کتاب ہے؟ ملاحظہ فرمائیں ۴

اگر کج رو ہے انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہوا، جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق ہے ہے لاماں کا فانی
خطا کسی کی ہے یارب! لاماں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی تیرا، جبریل بھی، تیرا بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا

پوری غزل اس قابل ہے کہ نقی کی جائے۔ اس گستاخی پر خود اقبالؔ کا ارشاد ہوتا
ہے ۵
چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند

حضرت یزداں کی بارگاہ سے اٹھ کر آنے والا یہی بندہ گستاخ جب بارگاہ
رسالتؐ میں حاضر ہوتا ہے تو تیور بدل جاتے ہیں اور لہجہ میں نرمی پیدا ہوتی
ہے۔ بلکہ لفظ لفظ سے عقیدت و محبت کی بارش ہوتی ہے ۶
کرم اے شہِ عرب و عجم کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے نہیں دماغِ سکندری

میرے خیال میں جو لوگ خدا سے محبت کرتے ہیں وہ صرف خدا سے محبت رکھتے ہیں
لیکن جو لوگ رسولؐ سے محبت کا اظہار کرتے ہیں وہ رسولؐ اور خدا سے بھی
محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ خدا خود اپنے محبوب کی محبت میں گرفتار ہے۔ چنانچہ
ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے ”جس نے محمدؐ کو چاہا اس نے مجھے چاہا“ اور یہی وہ مقام
حدا افتخار ہے جہاں کھڑے ہو کر رسولؐ عربیؐ فرماتے ہیں۔

” میں اللہ کے نور سے ہوں ، اور تمام مخلوق میرے نور سے ”

پہلے تو نور محمد پیدا ہوا پھر خدا کو کائنات کی تخلیق کا خیال آیا حکم ہوا
 کُنْ فیکون اور کائنات وجود میں آئی۔ جب کائنات وجود میں آئی تو باری تعالیٰ
 ذات رساتماب سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے ۴ کو لاک لاخلقت الالک
 (اگر آپ نہ ہوتے تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا) اقبال کو خدا کی کمزوری معلوم ہوئی تو
 انہوں نے خوب خوب گستاخی کی، لیکن محمدؐ کے دامن کو پکڑے رہے۔ اقبال کے
 اس طور سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ذات رساتماب کے شفیع ہونے پر کتنا
 یقین تھا۔ تب ہی تو شہ عرب و عجم کے حضور عجز و انکساری کے مجسم بن کر
 کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ۴

ترا جو ہرے لوزی پاک ہے تو فروغ دیدہ افلاک ہے تو

ترا حیدر بون! فرشتہ و حور کشا ہن شہ ہلاک ہے تو

اور اس نسبت پر اقبال کو ناز بھی ہے۔ چنانچہ اقبال کا سارا کلام اسی عشق محمدی
 کی منظوم تفسیر ہے۔ اس نے میرے نزدیک اس نے میرے نزدیک اقبال نہ تو
 مفکر ہیں اور نہ بدبتر وہ فلسفی ہیں نہ شاعر۔ وہ صرف شمع محمدی کا پروانہ ہیں، اور
 زبان حال سے کہہ رہے ہیں ۴

عشق تمام مصطفیٰ ، عقل تمام بولہب

گویا یہ سرمدی آواز تھی جو پہلی مرتبہ اردو شاعری میں بلند ہوئی۔ اردو شاعر
 میں نعت گوئی کا آغاز روزِ اول ہی سے ہوا ہے اردو کے قدیم و جدید شعرا نے
 چاہے اُن کا مذہب کچھ ہی ہو ذات رساتماب سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار
 کیا ہے۔ اس طرح نعت گوئی ایک روایت بن گئی۔ اس حد تک کہ عشقیہ مثنویاں لکھنے
 والے شعرا نے بھی حمد و نعت ہی سے مثنویاں کا آغاز کیا ہے۔ ہم کو حیرت تو

اس وقت زیادہ ہوتی ہے، جب مجازی عشق میں گرفتار شاعر محمد تقی قطب شاہ اپنی غزل کی ابتدا یا آخر میں محمد سے یا علیؑ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے۔ گویا اس زمانہ کا کلام کثافت اور لطافت کا عجیب و غریب امتزاج ہوتا تھا۔ ان قدیم شعراء میں نصر قی کی استثنائی صورت ہے۔ اگر آپ علی نامہ اور تاریخ اسکندری پڑھیں تو حمد کے ساتھ ساتھ نعت کے بھی بدلے ہوئے انداز میں پائینگے جہاں روایتی عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ شانِ خداوندی کے ساتھ شانِ محمدی کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس عقیدت اور شاعری میں ایک قسم کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہیں ملتی ہے۔ نصر قی کے بعد عالمی کی ذات اپنے دور کے روایات سے بغاوت کرتی ہے۔ اقبال نے تو نعت کو روایت کے بجائے حقیقت بنا دیا اور نعت گوئی کو مرصعانہ تصور سے نجات دلا کر انقلابی لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ اقبال کا یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی طرف نقادوں اور اقبال کے مفسروں نے کم ہی توجہ دی ہے۔ اقبال نے ذاتِ رسالت سے اپنی بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ اظہار ظاہری صورت و شکل اور معجزاتِ محمد و انہیں ہے۔ اقبال نے ذات سے زیادہ صفات سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ رسالتِ آیت کی ذاتِ بابرکات محض پوچھے جانے اور درود و سلام بھیجے جانے کیلئے نہیں بلکہ علمی زندگی میں اکتسابِ فیض کرنے کے لئے ہے۔ ذاتِ اے یہ عشقِ قوائے ذہنی کو مضحی اور ناکارہ نہیں بناتا بلکہ ایک نئے انقلاب کی قوت و طاقت عطا کرتا ہے ۹

قوتِ عشق سے ہر بیت کو بالا کر دے دہریں اکم محمد سے اجالا کر دے
 اقبال نے میلادِ نبیؐ سے متعلق ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ یادِ رسولؐ اس کثرت سے اور ایسے انداز سے کی جائے کہ انسان کا قلب بنوت کے مختلف پہلوؤں کا خود

لمہ بن جائے۔ یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرورِ عالمؐ کے
جو مقدس سے ہویدا تھی وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔
حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۹

آدمی دیدست باقی پوست است

دید آنت آنکہ دید دوست است

جو ہر ان فی کا انتہائی کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی
بد سے مطلب نہ رہے۔ ”چنانچہ اسی وجہ سے اقبالؒ عشقِ رسولؐ کو مومن
اصلی پہچان قرار دیتے ہیں

عالم ہے فقط مومن جانبار کی میراث

مومن نہیں وہ جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

جو صاحبِ لولاک ہے وہی مومن بھی ہے اور اسی مومن جانبار کی میراث یہ
سارے عالم ہے۔ اقبالؒ کی شاعری کا جائزہ لیں تو حرکت، عمل، عقل و عشق
م و حکمت اور خودی اور بخود کی سارے فلسفے ایک ہی ذات میں آکر
بیڑ ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح اقبالؒ کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی
رکاز نقطہ آغاز و آخر یہی ذات یا برکت قرار پاتی ہے۔ اسی منزل پر پہنچ کر
مال کہہ اٹھتے ہیں

وہ دانائے سب ختمِ الرسل مولائے کل میں نے

عبارتِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا

نگاہِ عشقِ دوستی میں وہی اول وہی آخر

وہی قرآن، وہی فرقان، وہی یسین وہی طاہر

تِ رسالتِ نبیؐ سے عقیدت و محبت کی بے پناہ مثالیں تاریخِ اسلام میں ملتی

اقبال میں۔ لیکن کاپہ والہانہ انداز شاید ہی کہیں ملتا ہو۔ اقبال کے کلام میں جہول و مفلوج عقیدت کے بجائے ایک طرحدار کی ہے۔ وہ نہیں کہتے کہ ہم خوار ہیں بدخوار ہیں پھر بھی تیسری محبوب کی اُمت سے ہیں۔ بلکہ ہر ہر لمحہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر ذاتِ رسالتاً سے رہبری و رہنمائی کی درخواست کرتے ہیں ۴
تو اے مولاے شربِ آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی، میرا ایمان ہے زنا ری

یا پھر یہ کہ ۵

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کرے
اقبال نے خاکِ مدینہ کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنایا تھا۔ اس لئے جلوہ دانش
افرنگ ان کو خیرہ نہ کر سکی۔ اس سلسلے کی نظموں میں، اے رُوحِ محمدؐ
بلادِ اسلامیہ بیوت اور غزلوں کے بیشتر اشعار کافی اہمیت کے حامل ہیں۔
اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ ۵

جہاں تمام ہے میراثِ مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتہ لولاکؐ

اس کا سادہ سا مطلب یہی ہے۔ چونکہ ساری دنیا کو خدا نے حضور ہی
کی خاطر پیدا کیا۔ اس لئے حضور کی وساطت سے ہر مردِ مومن خطابِ لولاکؐ کا
مستحق ہے۔ اور اس کی رو سے تمام جہاں مردِ مومن کی میراث ہے۔ یہ زمین ہی
نہیں بلکہ آسمان بھی عالمِ بشریت کے زو میں ہے
سبقِ ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زو میں ہے گردوں

اسی اِلقان بلکہ یقین محکم کے تابع اقبال اپنے ہر مسئلہ کو ذاتِ رسالتاً سے رجوع کرتے ہیں، اور جب وہ ذاتِ رسالتاً کو قرآن، فرقان، اہلسین اور طاہا قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس ذاتِ بابرکت کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں کو سنواریں، سدھاریں۔ اقبال نے جس مرد مومن کا تصور اپنے کلام میں پیش کیا ہے وہ محض فرضی نہیں ہے۔ اور نہ وہ مستقبل میں ایسے کسی مرد مومن کی تخلیق چاہتے ہیں۔ جو لوگ اقبال کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نیشے سے مرد مومن کے تصور کو مستعار لیا ہے۔ اصل میں وہ نہ تو نیشے کو سمجھے ہیں اور اور نہ ہی اقبال کو۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اقبال نے ذاتِ رسالتاً میں ایک مکمل انسان کی ساری خوبیوں کو مجتمع ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اس لئے، وہ چاہتے تھے یہی خصوصیات ہر امتی میں پیدا ہوں۔ اس طرح اسلام ایسے جاناؤں اور مردان ہنرمند کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش کا اظہار ان کی نظم حضور رسالت مآب میں یوں ہوتا ہے ۵۔

کہا حضور نے اے عندیباغ جاز کلی کلی بے تری گرمی نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوش جامِ دلا بے دل تیرا فنا دگی ہے تیری عزت سجود و نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوے گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفت پر داز

دہلی کے باغ جہاں سے برنگ ہو آیا

ہمارے واسطے کیا تحفے کے تو آیا

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش میں کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لادگی ہیں ریاضیاتی ہیں وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو ایک ابلیغ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکی سے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے ہو اس میں

مرد مسلمان کی پہچان کیا ہے ؟
 ہر لحظہ ہے مومن کی تائید و ثناء ان گنت
 قہاری و غفاری و قدوسی و جبروتی یہ چار غماز ہوں تو نبی ہے مسلمان
 مختصر یہ کہ ؟

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
 قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
 اقبال نے ذاتِ رسالت کو نبی نہیں، مسلمان قاری کو بھی قرآن قرار دیا ہے یہ
 افتخار محض امت محمدیؐ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، کسی اور کو نہیں۔ یہی وجہ ہے
 کہ مسلمان اقبال کی امیدوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اور ان کی بہتری اور اصلاح
 کی فکر انہیں ستانے لگتی ہے یہ محض کمی و مصیبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اقبال کی اس
 ہمہ گیر اور عالمی فکر کا نتیجہ ہے۔ جس کی مدد سے وہ دنیا کے انسانوں کو ایک
 اور نیک دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ خود مسلمانوں کا شیرازہ ابتر
 ہے تو وہ ذاتِ رسالت سے پوچھ بیٹھتے ہیں ؟

اب تو یہی بتاتا ہے مسلمان کہ ہر جاے
 اس راز کو اب غماش کر اے روحِ محمدؐ
 آیاتِ الہی کا نگہبان کدھر جاے

اقبال نے عالمی برادری، اخوتِ مساوات، الفاف و آزادی اور جمعیتِ آدم
 جو خواب دیکھا تھا۔ اس کی حقیقی صورت گری کے لئے اقوامِ عالم میں انہیں
 ایک ذاتِ ایسی نظر آئی جس کی روشنی زندگی کو مشعلِ راہ بنا کر اس خواب کو
 حقیقت میں بدل لیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ عشقِ
 محمدیؐ کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس آگ کی چنگاریاں مسلمانوں میں ایک

بھی باقی ہیں، اس لئے وہ سوسے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ اقبال کو ذاتِ رساتاب سے بے پناہ عشق ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی عشق کے نتیجہ میں اُمتِ محمدیؐ کا ہر فرد اپنی عزت ہے۔ لیکن اقبال کی یہ محبت نتیجہ ہے اس محبت کا جو ان کے دل میں آدم کے تعلق سے ہے یہاں ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کو انسانی تہذیب صرف مسلمانوں کے ساتھ میں محفوظ نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ رساتاب کی ذات اور عام مسلمانوں سے بار بار عتاب کرتے ہیں، اور اپنی بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام دستگیریشیا نے اقبال کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ۔
 ”اپنے ایک بلند پایہ خط میں اس حقیقت کی تشریح کے لئے ایک بیغ مثال دی ہے کہ مسلمانوں کے انتہائی غلبہ اور طاقت کے زمانے میں حبش کی آزادی محفوظ رہی لیکن مسیوینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا تھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مسیوینی کی خودی کسی آئینِ مسلم کی پابند نہ تھی۔ اور دوسری صورت میں خودی قانونِ الہی آدم اخلاق کی پابند تھی۔ انسانیت کے اجتماعی مفاد کی حفاظت اور اس کے احترام کی یہی راہ ہے۔“

اصل تہذیب احترامِ آدم است

اقبال دنیا کے تمام فلسفوں اور نظریوں کا مضامین مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سوائے ذاتِ رساتاب کے اصل تہذیب کی تعلیم کہیں اور نہیں ملتی تو وہ دستِ بدستہ کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں۔

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم

اقبال کے لئے ذاتِ رساتاب فکر و خیال کی روشنیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسی ذات ہے جس کا اسوہ حسنہ اقوامِ عالم کے سامنے ہے

اقبال کو حضور کے ظاہری حدود و خال سے یقیناً بے پناہ محبت ہے۔ لیکن ان کی نظر باطن پر جمی ہوئی ہے۔ جو قوت اور طاقت، محبت و شرافت، اخلاق و مروت اور انسانیت کا آئہ سمندر ہے اور موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذاتِ راتناہ^۱ سے بے پناہ عشق کا دایہانہ اظہار کرتے ہیں، اور پھر یہ عشق کیا؟ ان کو عزت نشین نہیں بناتا کارکہ عالم میں نئی قوت نئی طاقت بخشتا ہے۔ مرد خدا کا عمل اسی عشق سے صاحبِ فروغ ہے، عشق ہی اصل حیات ہے۔ جس پر موت حرام ہے۔ گو زمانہ کی رو-تند و سبک سیر ہے، لیکن عشق خود ایک ایسا سیل ہے جو زمانے کے سیل کو تھام لیتا ہے۔ عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ اقبال اسی عشق میں ڈوب کر کہتے ہیں کہ عشق دمِ جبیریل بھی ہے اور عشق دلِ مصطفیٰ بھی، عشق خدا کا رسول بھی ہے عشق خدا کا کلام بھی، عشق صہبائے خام بھی اور عشق کاسِ اکرام بھی، عشق فقیہِ حرم بھی ہے اور عشق امیرِ جنود بھی اور عشق ابنِ السبیل ہے۔ جس کے ہزاروں مقام ہیں۔ مختصر یہ کہ ۴

عشق کے مضارب سے نغمہ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات و حید قادری نے بجا طور پر لکھ لایے کہ علامہ اقبال کو ذاتِ راتناہ^۱ سے غیر معمولی عشق و محبت تھی۔ اُن کا حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ حُبِ نبوی کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا مزج اور مرکز ذاتِ رسالت مآب ہی ہے ۴

ایں ہمہ از لطفِ بے پایاں تو فکرِ ما پروردہ احسان تو
 (سب کچھ آپ کی عنایت بے پایاں ہی سے حاصل ہوا۔ ہماری فکر آپ کی انور
 احسان کی پروردہ ہے۔)

اقبال جب بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم کی منزلوں سے گذر کر
 ارغوانِ حجاز تک پہنچے ہیں تو ذاتِ رسالتؐ کیے مجو جوش اور ولولہ موجود تھا، اس
 میں تڑپ اور درد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی ان کے اندر دیارِ حبیبؐ کی زیارت
 کی آرزو پیدا کر دیتی ہے اور یہی ”بندہ گستاخ“ عشقِ محمدیؐ کی وجہ سے تڑپ کر
 خدا سے مخاطب ہوتا ہے۔

بدن و اماند و جلاغم در تنگ پست سوئے شہرے کہ لعلِ در رہ اوست
 تو باش این جا و با حاصاں بیا میسر کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست
 (آپ تو ہیں کعبہ میں رہ کر اپنے خاص بندوں سے ملے، لیکن مجھے تو منزلِ دوست کی تمنا
 ہے اور اس لئے میں مدینہ جارا ہوں) مدینہ سے محبت کا اظہار کر کے اقبالؒ نے
 خاکِ مدینہ کو محض مقدس و محترم نہیں کہا ہے، بلکہ اس کو مسلم کا ماویٰ سمجھتا
 قومیتِ اسلام کا وہ مقام جو آگے چل کر بنی نوعِ انسان کا مرکز بننے والا ہے۔
 چنانچہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں ”بلادِ اسلامیہ“ کی سیر کرتے
 ہوئے خوابگاہِ مصطفیٰؐ کے بارے میں کہا تھا۔

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰؐ دید ہے کبے کو قریحِ ابر سے سوا
 خاتمِ ہستی میں تو ناباں ہے مانندِ نلگیں اپنی غفلت کی ولادت گاہِ تھی تیری زمین
 تجو میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
 نامِ لہوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے جانیقی قیصر کے، وارثِ مسندِ جم کے ہوئے
 ہے اگر قومیتِ اسلام یا ہندو مقامِ ہندی بنیاد ہے اسکی نہ فارس نہ شام
 آہِ یزب! دیں ہے سلم کا فوجاوی ہے تو فقط جاذبِ تاثر کی شاعری کا ہے تو

جب تنگ باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
 صبح ہے تو اس چمن میں گو ہر شبنم بھی ہمیں!

گو اقبال کو حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی، لیکن جو زاد راہ انہوں
 نے اپنے لئے تیار کر لیا تھا، وہ ارمغان کی صورت میں ہمارے لئے چھوڑ گئے، اور
 جاتے جاتے ایک بصیرت افروز نکتہ بیان کر گئے، جو آج بھی مسلمانوں کو دعوت
 فکر دے رہا ہے۔

عمرِ حافر کی شبِ تار میں دیکھ میں آنے

یہ حقیقت کہ ہے روشنِ صفتِ ماہِ تمام

وہ بنوتِ بے سلاں کے لئے برگِ شیش

جس بنوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

○

حضرت انسان

۵

اتن روز اول ہی سے محبوب و معتب رہا ہے۔ اس کی تخلیق خدا کی محبوبیت کا نتیجہ تھی، اور جب وہ ابلیس کے بہکاوے میں آگیا تو معتب ٹھہرا۔ لیکن اس عتاب میں بھی شان محبوبیت غالب رہی۔ جنت سے نکالا جانے والا انسان اشرف المخلوقات کہلایا اور نیابت الہی کا مستحق بھی قرار پایا، اور ایک نئی دنیا ایک نئی زندگی سے بھی آشنا ہوا۔ اقبال کے کلام میں انسان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال تخلیق آدم کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ اور وہ خالق و مخلوق کے پرستہ باہمی سے بھی خوب واقف ہے۔ اس سلسلے میں اس کی تین نظمیں راست طور پر انسان سے متعلق ہیں۔

بانگ درا میں جو نظم انسان ہے۔ اس میں قدرت کی اس ستم ظریفی کو ظاہر کیا ہے کہ خدا نے انسان کو ایک راز بنا کر پیدا کیا، اور اس پر ستم یہ کہ کائنات کی حقیقت کو اس سے چھپایا گیا۔ زندگی کی اس حقیقت کو پانے کا ذوق انسان کو بے تاب و بے چین کر دیتا ہے۔ گویا جستجو اور تلاش ہی اس کا مقدر ہے اور اس جستجو اور تلاش میں وہ تنہا ہے۔

کوئی نہیں غمگسارِ انسان

کیا تلخ ہے روزگارِ انسان

اسی مجموعہ کی دوسری نظم میں اقبال نے ان ہی جذبات و احساسات کا اظہار کیا، لیکن یہاں انسان کے اندر جو تلاش کرنے اور کچھ پانے کی جو صلاحیت ہے

اسکا وہ اظہار کرتا ہے۔ انسان مجبور محض نہیں ہے۔ وہ یقیناً اپنے خدا کے
ساتے مجبور اور بے بس ہے۔ لیکن کائنات اور اس کی اپنی زندگی اسی کے تابع
ہے۔ انسان کی ہر قوت، سرگرم تقاضہ ہے!۔ انسان اقبال کے بارے میں کہتا
ہے ۹

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم

یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈلے ہدیت چمنستان کی

یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

انسان کو جب اپنی قوت کا اندازہ ہوتا ہے تو کائنات کو جس میں زمین آسمان
اور سمندر شامل ہیں فتح کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ بلکہ ہجر گستاخانہ
ہو جاتا ہے۔

اگر مقصود کلی میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے

مرے ہنگامہ ہائے نوبہ کی انتہا کیا ہے

منشاء خداوندی بھی یہی ہے کہ انسان بحروبر کا علم حاصل کرے۔ وہ آسمان
اور زمین میں دولت چھپی ہے، اپنی اسی تلاش و جستجو کے ذریعہ اپنے تقوف
میں لائے۔ قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان ہی ذخیروں کی طرف اشارہ
کیا ہے، جو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کئے گئے ہیں

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا نے جو زمین میں ہے وہ تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے

(۶۵: ۲۲)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے خدا

نے مسخر کر دیں

(۱۹: ۶۳)

تمہارے دریا کو مسخر کر دیا تاکہ اس میں خدا کے حکم سے کشتیاں چلیں

اور اپنے رزق کو تلاش کرو۔ (۱۱:۴۵)

خدا نے انسان کے لئے ساری مخلوقات کو تابع کیا، پہاڑ کو، آفتاب و ماہتاب کو حد تو یہ کہ رات دن، چاند، سورج سب اس کے تابع کر دے گئے۔ اس حقیقت سے جہاں معرفت انسان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے وہیں اس کے علم، قوت اور ذوق جستجو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس اس بات پر نہیں کہ انسان ان نعمتوں سے محروم ہے بلکہ افسوس اس کا ہے کہ وہ اپنی، قوت و طاقت سے واقف نہیں ہے۔ اقبال کی ساری جستجو یہی ہے کہ وہ حضرت انسان کو اسی کی اپنی قوت و صلاحیت سے واقف کرائے۔ فلسفہ خود کی حقیقت بھی بس اتنی سی ہے۔ اقبال انسان کو خودی کا جو درس دیتا ہے۔ اس کا بنیادی وجہ یہی ہے۔ وہ انسان خصوصاً مسلمانوں کو اس دولت بیش بہا سے مالا مال کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسانی محاشرہ کی گراوٹ کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنی خودی سے آگاہ نہیں ہے ۴

تو راز کن فکان ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خود کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمہ ہوا

عالم خونذیری نے " فکر اقبال " کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے۔ " اقبال کی فکر ایسے ہی افراد کیلئے ہے۔ جو واقعی شخصیت کے حصول کے طلبگار ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اس کے میخانے میں کوئی گنجائش نہیں جو ازل کا سرور حاصل کرتے ہیں اور جنہیں ابد کی فکر نہیں "۔

اقبال نے ایسے افراد کی بھی فکر کی ہے جو ازل اور ابد سے لاپرواہ زندگی کے صحرائیں بھٹک رہے ہیں۔ اقبال کے مخاطب اصل میں وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو یا تو بچھپا لیا ہے یا جو محض زندگی سے فراد

اختیار کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ایک عام انسان، عام انسان ہوتے ہوئے بھی ایک خاص انسان ہے۔ جسے وہ فوق البشر یا مردِ مومن دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک عام انسان اپنی خودی کے ذریعہ مردِ مومن کے مرتبہ کو حاصل کر سکتا ہے۔ خودی محض خود اعتمادی، خوداری اور خود کی پہنیاں صلاحیتوں کو پہچاننا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فلسفہ ہے، یہ ایک فلسفہ ہی نہیں ہے ایک مسلک بھی ہے۔ خودی کی تربیت کے تین مرحلے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الہی ہیں اللہ تبارک تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو جو سب سے بڑی ذمہ داری سونپی ہے وہ نیابت ہی ہے۔ ۴

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا۔

اس کام کا اہل ہر وہ عام انسان ہو سکتا ہے جو اپنی خودی کے ذریعہ اس مرتبہ و مقام کا خود کو اہل ثابت کرتا ہے۔ اقبال نے تو انسانوں کے دریاں کے کسی بھی قسم کی تخصیص کو مٹایا ہے اور یکساں طور پر انہیں خودی کی تعلیم دیتا ہے اس کے بچانے میں سب انسان برابر ہیں

بلاشبہ اقبال شاعرِ فطرت بھی ہے اور شاعرِ فلسفہ بھی۔ خودی

کا یہ پرستار بے خودی میں ڈوب جانے کی تلقین کرتا ہے۔ علم و عشق کے موکے عشق کی حاکمیت پر زور دیتا ہے۔ زمان و مکان کا نیا حرک نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ جبر و قدر کے سائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اور اسی حیثیت سے اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا جاتا رہا ہے۔ اشفاق حسین نے دیگر مفسرین اور ناقدین کی طرح فلسفہ اور تاریخ کی روشنی میں کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا۔ ان کی کوشش یہ رہی کہ خدا، انسان اور کائنات کا باہمی رشتہ کیا ہے، جان سکیں۔ اقبال کی شاعری کا مرکزی نقطہ خدا، کائنات، انسان کے

باہمی ربط و تعلق کو پہچانتا ہی ہے۔ سچے اور اچھے علم کا ابلاغ بھی اقبال کی ساری بُرائی اسی میں ہے کہ اس نے اپنے کلام کے ذریعہ ان کو خود ہی کی تعلیم دی، اور بے پناہ قوت تخلیق سے آگاہ کیا، تاکہ وہ تو عشق سے کائنات کی تسخیر کرے اور کائنات کو مناسب انداز میں اس لئے کہ وہ اپنے برتاؤ کیلئے خدا کے سامنے جوابدہ بھی ہے۔ اشفاق حسین نے اپنی تصنیف "اقبال اور انسان" میں اسی نقطہ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں !

"ان اوراق کا مقصد ان مختلف گوشہ ہائے افکار کا تفسی ملاحظہ نہیں بلکہ ان راہوں کی نشاندہی مقصود ہے۔ جن پر فکر و خیال کے قافلے انسانیت کی تلاش و جستجو میں سرگرم سفر ہو رہے ہیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ اشفاق حسین نے "مقام اقبال" میں اقبال کے مقام کا تعین کرتے کرتے اقبال کو تلاش کر لیا ہے۔ جب کہ "اقبال اور انسان" میں اقبال اور تصور انسانیت سے بحث کرتے کرتے انسان کو تلاش کر لیا گیا ہے اقبال جس عہد کی عکاسی کر رہا تھا وہ عہد جدید سے کچھ مختلف نہیں تھا قومی اور بین سطح پر نفرت و حقارت اور جنگ و جدل کی وہی کیفیت تھی جو آج ہے آج صرف یہ ہوا ہے کہ نام بدل گئے ہیں۔ میسولینی، ہٹلر اور ہینرلین کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ انسان کل بھی مظلوم تھا آج بھی ہے۔ اللہ کی زمین کل بھی خون آلود تھی، آج بھی ہے۔ انسانی اقدار کا جہاں تک سوال ہے وہ کل بھی پاکمال تھے اور آج بھی تاراج ہیں! یہ سب اس وجہ سے ہے کہ انسان کے اندر شر، فساد اور بہمیت کی خصوصیات ہیں وہ قابو میں نہیں ہیں۔ انسان خود اپنی برائیوں کے سامنے خمیورویے بس ہے۔ دنیا میں پھلی اس بہمیت اور

خونریزی کا واحد علاج یہی کہ انسان اپنے شر پر قابو پائے۔ اس شر پر قابو پانے کا نام بھی خودی ہے۔ خودی ایک ایسی طاقت ہے۔ جس کی مدد سے انسان اپنی ہر کمزوری کا تدارک کر سکتا ہے۔ وہ خودی کے ذریعہ جہاں جہاں کی ہمت بدل سکتا ہے۔ وہیں وہ اپنی ذات میں بنیاد کی تبدیلیاں بھی پیدا کر سکتا ہے خودی انسان کے ہاتھ میں ہتیار ہے۔ اس ہتیار سے وہ اس شیطان کو مار سکتا ہے جو اس کے اندر ہے۔ اور اس شیطان کو بھی جو کائنات میں تباہی اور درندگی کا کھیل کھیل رہا ہے۔

اقبال کہتا ہے ۵ یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی

کہ خودی کے عارفوں کا ہے، مقام پادشاہی

تری زندگی لکھی ہے تری آبرو اسی سے

جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رو سیاہی

بشرطیکہ انسان کو خودی کی معرفت ہو جائے۔ اور اگر اس معرفت ایک بار

ہو گئی تو پھر ۴ خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں!

اقبال خودی کی حقیقت کو پا گیا تھا۔ اس نے اس حقیقت کو اپنے

کلام کے ذریعہ عام کرنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی شاعری کے بارے

میں کہا ۳ فردوس میں رومی سے یہ کہتا عطا سنانی

شرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آتش

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آنحضرت

ایک مروتقندر نے کیا راز خودی فاش

خودی کے علاوہ اقبال نے عقل، عشق اور فقر پر بھی زور دیا ہے۔ خصوصاً

عقل و عشق پر مصلحانِ خوب خوب باندھے ہیں حالانکہ یہ فقر، عقل و عشق

خودی کے متوازی کوئی علیحدہ اصطلاحیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے تین ستون ہیں، جن پر خودی کی تعمیر ہوئی ہے۔ حد تو یہ کہ اقبال نے خودی کو اسلام اور اسلام کا خودی نام دیا ہے ۴

روح اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی
زندگانی کیلئے نارِ خودی، نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصل نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا سمور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کہ ہے توجیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غبور

اور یہی خودی حیاتِ ابدی بھی ہے ۵

زندگانی ہے صدفِ قطرہٗ نساں ہے خودی
یہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گہر و خود گہرِ خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

انسان کی صلاحیتوں میں عقل و دانش بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ عقل کے بغیر زندگی کا تصور بے معنی ہے۔ اقبال نے عقل کو اس کا مستحق مقام دیا ہے لیکن وہ دل کی قوت کے زیادہ قائل ہیں۔ اس ضمن میں "عقل و دل" اقبال کے تصور کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گذر فلک پہ مرا کچھ تو کس قدر رسا ہوں میں
عقل خوجہ کو خضر راہ بتاتی ہے اور گہمتی ہے کہ میں ہی منظرِ شانِ کبریا ہوں میں

ہی مفسر کتاب حیات ہوں۔ اور وہ دل کو حقارت آمیز انداز میں مخاطب ہو کر
اسے خون کی ایک بوند کہتی ہے۔ جبکہ وہ غیرت لعل بے بہا ہے۔ دل اس کی
ان باتوں کو سن کر جواب دیتا ہے۔

رازِ بختی کو تو سمجھتی ہے

اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے

تو خدا جو، خدا نا ہوں میں

اور پھر دل عقل سے اس کے مقام کا پتہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

عرشِ ربِ جلیل کا ہوں میں

گویا اقبال نے عقل کو آئینہ دکھا دیا۔ عقل کی دل کے مقابلے میں کم حیثیت

قرار پانے کے نتیجہ میں اقبال اکثر اوقات اُسے تنہا چھوڑ دینا چاہتا ہے۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق خودی کی تعمیر میں کلیدی حصہ ادا کرتا ہے۔ اقبال کے یہاں عشق ایک قوت

و طاقت ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ

عشق ہے اصل حیات، موت اس پر حرام

اقبال نے عشق کو دمِ جبریں بھی قرار دیا ہے، دل مصطفیٰ بھی، عشق خدا کا

رسول ہے۔ عشق خدا کا کلام بھی، عشق نفیہ حرم ہے۔ اور عشق امیرِ جنود

بھی عشق صدقِ خلیل بھی ہے۔ اور عشق صبرِ حسین بھی ہے۔

معرکہ وجود میں بدرِ حسین بھی ہے عشق

حد تویہ ۴ عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بیکدہ تصور

جب انسان جذبہ عشق سے سرشار ہوتا ہے تو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ زمین
و آسمان اور سمندر کے اندر جو دولت اس کے لئے مسخر کی گئی ہے اس سے
استفادہ کر کے۔ عشق یہاں ایک روایتی جذبہ نہیں ہے جو انسان کو مثل
پروانہ شمع کے گرد گھومنے اور جل مرنے پر اکاتا ہے بلکہ اس کے اندر زندگی
کی روشنی کی آرزو کو چمکاتا ہے۔ اپنے اس خیال کو اقبال نے "شمع و پروانہ"
میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ظ الفزاری نے ناساگا کے
حوالے سے کہا ہے کہ اقبال انسانی شخصیت کا الوسیلہ میں فنا ہونا نہیں چاہتے
بلکہ نور الہی جذب کر کے اس کی جداگانہ زندگی چاہتے ہیں۔ عشق کی فتح اس میں
ہے کہ وہ انسان کی روح میں نور کی تمنا جگا دے اور بقا کی طرف لے جائے
ان جب نور سے الکتاب کرتا ہے تو اس کی ذات روشن ہو جاتی ہے، اور
اس کے خوابیدہ صلاحیتیں ابھر آتی ہیں جو خدا سے منسوب ہیں وہ انہی معنوں
میں بندہ مولا صفات کہلاتا ہے۔ جب اللہ کی صفات اس کی ذات کا حصہ
بن جاتی ہیں، تو وہ سراپا خیر ہی خیر بن جاتا ہے۔ اقبال نے ایسے ہی ان بن
کو "مرد مومن" کا نام دیا ہے۔ مسجد قرطبہ میں اقبال نے مرد مومن کے اوصاف
حمیدہ کا بڑے ہی خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے ۵

بچھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اسکا شوق اسکا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا ، بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفرین ، کار کشا ، کار ساز
خاک و نور کا ہواد ، بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل ، اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو
نرم ہو یا نرم ہو پاک دل پاک بار

جس طرح قرآن حکیم کا مخاطب ایک انسان ہے۔ اسی طرح اقبال نے بھی انسان
ہی کو مخاطب کیا ہے۔ ایک انسان کی تربیت ، اس کی تعلیم ہی قرآن حکیم کا
بھی اور قرآن اور سنت کی روشنی میں کلام اقبال کا مقصد ہے۔ اقبال نے
بھی کہا تھا کہ جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہی
قرآن حکیم کے مخاطب ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کلام اقبال کو بھی اسی انداز
سے پڑھیں اور سمجھیں تو یقیناً اس کلام کا اثر ہمارے دل و دماغ پر ہوگا۔
راست اور گہرا۔ !

مرد مومن محض ایک تصویر ہی نہیں ہے۔ اقبال نے پیغمبر اسلام
آنحضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان تمام صفات کو
جسم دیکھا ہے۔ یہ ایک انسان کی تکمیل کی صورت ہے۔ جو جذبہ عشق کے نتیجے
میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ خودی کی تکمیل کی اعلیٰ ترین صورت بھی ہے۔ جس
طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں ایک عام انسان
کی اعلیٰ ترین تربیت کا اہتمام و انصرام کیا ہے۔ اس کی تقلید میں اور قرآن

کئے نے دیا خاک جیہ کو یہ پیغام

جمعیت اقوام - جمعیت آدم

اقبال نے اپنے عہد میں جنیوا کانفرنس کا حال دیکھا اور آج ہم اقوام متحدہ کا انجام بھی دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ ہیرو شہما کی تباہی کو دیکھ چکی ہے اور آج مسم فلسطین کو برباد ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ بوسینا پر مظالم آج بھی جاری ہیں۔ مسیح تو یہ ہے کہ اسلام عالمی بھائی چارہ اور وحدت و اخوت کا جو درس دیا ہے وہ جب تک عام نہیں ہوتا، ان ان ان کا اسی طرح دشمن بنا رہے گا۔

قیامت ہے کہ ان ن نوع ان کا شکار ہے!

اقبال نے مسلمان کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کی بنیاد ہی وجہ یہی تھی کہ وہ پہلے خود سنبھل جائے، اور سنبھلے گا تو جمعیت آدم سنبھلے گی! اس غرض کے لئے اقبال نے اپنے فلسفہ خودی سے کام لیا ہے۔ ایک جگہ اقبال نے کہا تھا۔

جو کسی ناسازگار ماحول کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے خود اپنے اندر مکمل انقلاب پیدا کرنا ہوگا۔ اپنی آزاد اندرونی زندگی پر ایک مضبوط عقیدے کے بغیر کسی مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ اگر تم اپنی آرزو کو بار آور دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی ساری خودی کو اپنی ذات میں مرکوز کر دو،

خودی کا مقصد کیا ہے اقبال نے بتا دیا، اقبال ہی کی زبان

سے سنئے، خودی کیا ہے؟

یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے

خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

و سنت رسولؐ کی پیروی میں اقبالؒ نے ایک عام انسان کی ذہنی و قلبی تعمیر کا بیڑا اٹھایا ہے اقبالؒ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ نہ تو عارف ہے، نہ مجدد، نہ محدث نہ فقہیہ، اور نہ اس نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مقام نبوت سے آگاہی رکھتا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ عالم اسلام پر نظر رکھتا ہے اور وہ زمانے کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے۔ وہ کہتا ہے ۴

عمرِ حاضر کی شبِ تاری میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تام
” وہ نبوت ہے مسلمان کیلئے برگِ حشیش

” جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام ”

اقبالؒ ایک دروِ سزا دل رکھتا ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کی زبانِ حالی پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اقبالؒ نے اکثر و بیشتر مسلمان کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ تنگ نظر اور متعصب اور متعصب تھا بلکہ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا رہا کہ مسلمان کی بیداری عالمِ انسانیت کی بیداری ہے۔ مسلمان چونکہ ایک ضابطہ حیات رکھتا ہے جو بنی نوعِ انسان کی فلاح کا ضامن ہے، اس لئے پہلے وہ مسلمان کی اصلاح فرد کی سمجھتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمی اور اخلاقی مذہب ہے، نظریہ حیات! اس لئے اسلام نشر و اشاعت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اپنے اس خیال کو اقبالؒ نے اپنی نظم ”مکہ اور مینا“ میں واضح طور پر ظاہر کیا ہے ۴

اس دور میں اقوامِ محبت بھی نبوی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ مللِ حکمتِ افرنک کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ہدایتِ آدم

تلاشِ آدم

باری تعالیٰ نے آدم کی تخلیق کی، آدم زمانہ کی نیرنگیوں میں گم ہو گیا
آدم ابھرا اور پھر فضاؤں میں کہیں کھو گیا ہے۔ اسی آدم کی تلاش اقبال کا
بنیادی مقصد ہے ۹

لمنا ترا اگر ہنس آس تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار ہنس ہے

اور اس مقصد میں اقبال تنہا نہیں ہیں۔ اقبال کے ذہن اور رُوح کی پرواز ^{خط}
ہو کہ اس کام میں خود خدا کی ذات پاک کو بھی شریک کر لیا ہے ۹

قدم در جستجوئے آدم زن

خدا ہم در تلاش آدمی است

آخر یہ آدمی کون ہے اور کہاں ہے؟ جس کی تلاش میں خود خدا سرگرداں و

حیراں ہے۔ اقبال نے اس سوال کا جواب اپنی دو نظموں "فرشتے آدم کو

عزت سے رخصت کرتے ہیں" اور "روحِ ارمنی آدم کا استقبال کرتی ہے"

میں واضح طور پر دیا ہے "وہ حضرت انسان" جنہیں عرف عام میں آدمی پکارا

جاتا ہے اور جنہیں فرشتے رخصت اور رُوحِ ارمنی جن کا استقبال کرتی ہے

ان کا اہم شاہد یہ مختصر لیکن بلیغ انداز میں ان کی آخری نظم میں ملتا ہے۔ پوری کی

پوری نظم یہاں نقل کرتا ہوں۔ نظم بے حد مختصر ہے، لیکن حاصلِ کلام ہے ۹

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی

کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی

خودی کیا ہے ؟ راز درون حیات
خودی کیا ہے ؟ بیداری کائنات

۵

خودی وہ مجسّم ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آجیج اے سمجھا اگر تو چہارہ نہیں

اقبال کہتا ہے کہ خدا کی خودی میں گم ہے ۔ اگر انسان خدا کا متلاشی ہے اسے
خودی میں اسکی تلاش کرنی چاہیے اور پھر ۴
بے ذوق نمود زندگی موت
تغیر خودی میں ہے خدا کی

حضرت انسان کا مرتبہ و مقام بڑا ہے ۔ اتنا بڑا کہ وہ نائب خدا ہے ۴
برتر از گردوں مقام آدم است

اس نے اقبال حضرت انسان کو ایک نئی دنیا کی تعمیر پر اکٹا ہے ۔ ایک
ایسی دنیا جو ہر اعتبار سے رشک جنت بن جائے ۔ جہاں انسان انسان
کا بھائی ہو ، اور ربط باہمی کے ذریعہ ایک نئی تہذیب کی تشکیل کر رہا ہو ۔
ایک ایسی تہذیب جس کی بنیاد احترام آدم پر رکھی گئی ہو ۔

اصل تہذیب احترام آدم است !

یہی حضرت انسان کی مزاج ہے !!

کوئی دیکھے تو ہے باریک نظرت کا مجاہب اتنا
 نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پینہاں
 یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو
 کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے دوق عریانی
 یہی فرزند آدم ہے کہ رشک خویش سے
 کیا ہے حضرت یزداں سے وریاؤں کو طوفانی
 فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
 غرض انجم سے ہے کس کی شبستاں گی نگہبانی
 اگر مقصود کلی میں ہوں تو مجھ سے ماورایا ہے
 میرے ہنگامہ ہاں نو بنو کی انتہا کیا ہے

مقصد کلی انسان ہے۔ اس سے بالاتر کوئی چیز نہیں، اور بے قیود اور مہر
 خدا کی ذات ہے۔ اس لئے انسان کے جرنئے ہنگامہ تہی جو اس کی زندگی پر دلالت
 کرتا ہے کوئی انتہا نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی نظم فرشتے آدم کو جنت سے رخصت
 کرتے ہیں، اور روح ارضی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور پھر جن خیالات
 کو اقبالی نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، ان تمام کو اختصار لیکن کمال حسن
 و فن کے ساتھ حضرت انسان میں پیش کیا ہے۔ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت
 کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے انسان تجھے روز و شب کی بے تابی عطا ہوئی ہے اور
 تجھے خود خبر نہیں ہوئی ہے کہ تو خاک کی ہے یا سیلابی۔ گو تیری نمود خاک کی رہیں منت
 ہے، لیکن تیری سرشت میں چاند تاروں کی آب و تاب اور ان کی بے چینی بھر دی
 گئی ہے۔ اور تو اتنا حسین ہے کہ خواب میں بھی اگر اپنا جلال دیکھے تو مجرم اٹھے گا
 وقت سحر ترے گریہ اور آہ و ناری سے نخل کہن کی شا دہلی اور تری آوازا سے

زندگی کا چیمبرے پردہ ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ قدرت نے تیرے ساز کو مانند مفلح
بنایا ہے۔

انسان کے اندر یہ جو تخلیقی و روحانی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اُن کے
پیش نظر رُوح ارضی چل جاتی ہے جب آدم آسمان سے اُٹھ کر زمین کی طرف
روانہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس نو وارد گلستاں کو دعوتِ نظارہ بھی دیتی ہے
اور دعوتِ عمل بھی۔ اصل میں یہ پوری نظم حضرت ان کا لاکھ عمل ہے جس
کی مکمل پابندی کے بغیر نہ تو خالق کا مقصد پورا ہوتا ہے نہ مخلوق کا۔ اور تخلیق آدم
کا یہ کارنامہ بیکار محض تو نہیں ہے!؟ یہ زمین یہ آسمان، مشرق سے ابھرتا
ہوا سورج، ایامِ جدائی، وصل کی کیفیت، بے تابی، معرکہِ یم ورجاء، یہ
یہ گھٹائیں، یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضاؤں، یہ کوہ و صحرا، یہ کمند، یہ
ہوائیں، مختصر یہ پوری کائنات آخر کس کے لئے؟ رُوح ارضی کہتی ہے کہ
یہ سب تیرے لئے ہے اور یہ سب تیرے منتظر ہیں۔ تو اُسے گا تو ان کا مقدر
جاگ اُٹھے گا۔

ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبالِ حضرت انسان کو خودی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اراکھ
جد و جہد پر اُگاتے۔ کائنات میں انسان کی اہمیت اوجاگر ہوتی ہے۔ اقبال کے
مبصروں اور مفسروں نے اقبال کے مردِ مومن کی نشاندہی تو کی ہے۔ لیکن اس
آدمی کی بہن جس کی جستجو انہیں کوہِ بہ کوہ، صحرا بہ صحرا لئے پھرتی ہے۔ اسی آدمی
کی خصوصیات کا اشارہ ہمیں ان اشعار میں ملتا ہے۔
سمجھ گاہِ نہ تری آنکھوں کے اشارے۔ دیکھیں گے تجھے دور سے گردِ دل کے اندر
تا پید ترے بحرِ تخیل کے کنارے۔ پہنچیں گے ملکِ تک تری آہوں کے فرارے

تعمیری خودی کو اثر آہ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضویرے شر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیسرے منہر میں
چھتے نہیں ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ بکر میں
اے پیکرِ گل کو شش پیہم کی ہزار دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے تو جس محبت کا خسیدار ازل سے
توسیر صنم خانہ اسرار ازل سے محنت کش خونیز و کم آزاں ازل سے
ہے راکبِ تقدیر جہاں تری رضا دیکھ

اقبالؔ نے حضرت انؔ کو پیرِ صنم خانہ اسرار، محنت کش، خونیز و کم آزار، اور
جس محبت کا خریدار بتایا ہے اور اسے تعمیری خودی اور کو شش پیہم کی تلقین کی ہے
خودی، حرکت و عمل، اور عشقِ اقبالؔ کے دلچسپ موضوعات ہیں، اور انؔ کی
تشریح سے کلامِ اقبالؔ کی عبارت ہے۔ ماہرینِ اقبالیات نے ان موضوعات پر
کھل کر بحث کی ہے۔ اس سے انؔ کی مرادِ اقبالؔ کے کلام کی تشریح کے ساتھ
ساتھ قاری پر کلام کی اہمیت و مقصد کو واضح کرنا ہے۔ اور اس کے بیچ میں
ایک ایسے انؔ، یا انؔوں کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل یا پھر یہ کہ تمام
انؔوں کو انؔ کے حقیقی روپ میں تبدیل کرنا ہے جو اپنی تخلیق کے موقع پر تھا اور جو
ابلیس کے لئے بھی قابلِ تعظیم تھا۔ قرآن حکیم نے اس عظیم آدمؔ کی تعریف کرتے ہوئے
اُسے اپنا جانشین بنایا تھا۔ اور جس کے دل کو اپنا مان و مخزن بتاتے ہوئے اپنی
ذات کا پر تو قرار دیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبالؔ کے اس شعر کی
اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو تجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نوبہ نو کی انتہا کیا ہے

انسان کا جذبہ عشق لافانی ہے ، اور انسان اسی جذبہ عشق کی مدد سے لافانی زندگی کا مالک بن جاتا ہے ۔ اس کے ہنگامہ پائے فوہو کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ علم نے انسان کو فضیلت عطا کی اور عشق نے اسے لافانی بنا دیا ۔ اور ان دو عطائے کی وجہ سے انسان بندہ مولا صفات کہلایا ۔ اس طرح علم بغیر عشق انسان کے معیار پر بھی قرار پائے ۔ جس طرح عشق بغیر علم شیطانت ہے اسی طرح علم بغیر عشق ابلیسیت ہے ۔ اقبال کی دلی آرزو یہی ہے کہ وہ انسان کو انسان ہی کے روپ میں دیکھیں ، اور جب یہ انسان کہیں نظر نہیں آتا تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے ۔ وہ ماضی کی تاریکیوں میں ڈھونڈتے ہیں وہ حال کے جاں میں ٹٹوتے ہیں اور مستقبل سے پراسید ۔ اپنے کھوے ہوئے کی مستقبل میں تلاش و تخلیق کرتے ہیں ۔

اقبال کی شاعری میں عقل و عشق کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اکثر نادین اقبال نے کلام کی روشنی میں عقل کو کمتر درجہ عطا کیا ہے ۔ حالانکہ منشاء صہی بھی یہ نہیں رہا کہ وہ عقل کی اہمیت و اماندیت سے انکار کریں ۔ البتہ انہوں نے ”کبھی کبھی“ عقل کو پیچھے چھوڑنے کی بات کی ہے ۔ اس لئے کہ جذبات بھراؤ کے بغیر انسانی کشتی منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتی ۔ وہ اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ لیکن منزل کا شعور عقل ہی کا رہن منت ہوتا ہے ۔ بھلا ایسی صورت میں اقبال عقل کی اہمیت کا انکار کر کے اپنی ہم عقلی کا ثبوت کیوں دینے چلے ؟ عقل خضر کا کام انجام دیتی ہے ۔ جب کہ عشق انسان کو موجوں سے نکلانے کا حوصلہ عطا کرتا ہے ۔ یہ ایک قوت ہے جو انسان کو طاقت اور توانائی عطا کرتی ہے ۔ اشفاق حسین نے اس نکتہ کو کچھ اس طرح واضح کیا ہے ۔ ”انسان کی شخصیت کی تعمیر و ترقی کے لئے جس جسم و جان کی رفاقت ضروری ہے کہ ظہر کا

اثر باطن پر اور باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے۔ اقبال کی زبان میں جسم اور روح کی ایک سیرت ہے) اسی طرح عقل اور عشق زندگی کے ارتقاء میں ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔ عشق کی خاصیت تخلیق ہے، اور علم کی تحقیق، کائنات کی تسخیر کرتا ہے اور علم کی بدولت ہم ساری کائنات کی تغیر و تشریح کر سکتے ہیں اور انسانوں کی تقدیر اس علم کی تدبیر سے وابستہ ہے۔

چشم او بر واردات کائنات

تا بہ بیند محکمت کائنات

علم کی بدولت ہم واردات سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور جزئیات سے کلیات بنا سکتے اور قوانین قدرت سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اگر علم اپنے آپ کو اعلیٰ مقاصد کے تابع رکھے تو وہ خیر ہے ورنہ شر بن جاتا ہے۔ بے سوز دل یعنی عشق کی رفا و رہنمائی کے بغیر وہ تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

علم را مقصود اگر باشد نظر می شود ہم جادہ و ہم را ہیر

اقبال نے یہ جو عقل و عشق کا معرکہ کھڑا کیا ہے۔ اس کا تجزیہ دو مختلف انداز سے کرنا چاہیئے۔ انسان کی تخلیق کا منشاء عبادت نہیں ہے، تصرف ہے۔ اور محض تصرف نہیں، عبادت بھی ہے۔ ایک طرف تو خدا ہے۔ اور دوسری طرف کائنات ہے۔ کائنات کا وسیع تر ہے پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ خدا ظاہر نہیں، عام انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ لیکن وہ ہے ضرور، اور ساری کائنات پر محیط ہے، وہ انسان پر بھی متصرف ہے۔ اس حد تک انسان کائنات کی طرح مخلوق ہی ہے۔ لیکن انسان کی عظمت یوں ہے کہ وہ خالق کا منکر بھی ہو سکتا ہے۔ انکار کی قوت انسان کو دیگر مخلوقات سے حمیزہ کرتی ہے۔

امبس نے کہا تھا

ہے مرے دستِ تصرف میں جہاں رنگ و بو

کیا زمین کیا مہر و مہر کیا آسماں تو بستو

آج ان عقل و علم کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں وہ بھی ابلیس
ہی کی طرح اپنے مشیروں سے یہی انداز گفتگو اختیار کر سکتا ہے اور کرتا ہے
اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان خدا سے دور ہو جاتا ہے اور یہی وہ منزل ہے
جہاں عشق انسان کی عقل کیلئے خضرِ راہ کا کام انجام دیتا ہے۔

اقبال کا عشق دو صورتوں میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ عشق
ایک قوت ہے جو انسان کو اپنی منزل سے ہمکنار کرتا ہے۔ عشق تماشائے ذات
ذات ہے اور حیات و محبت بھی۔ عشق مکاں و مکین ہے اور زماں اور زمین بھی
اور عشق سراپا یقین ہے اور یقین فتح یاب بھی، مختصر یہ کہ

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات

عشق کے اس تصور کے بغیر کائنات کی تسخیر ممکن نہیں۔ عشق زندہ انسانوں کی
طرح زندہ قوموں کا سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ اس انداز سے مشرق و مغرب کی
ان قوموں کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے جنہوں نے علم و عشق کے توازن سے تسخیر
مہر و مہر کا فرض انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں۔ اقبال کو اس بات کا دکھ ہے
کہ مسلمان جو تسخیر کائنات کے اس راز سے سب سے پہلے واقف ہوا، وہ
علم اور عشق — ان دونوں نعمتوں سے محروم ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحبِ قروغ

عشق ہے اصل حیات، موت ہے اُسپر حرام

مسلمانوں کے نزدیک عشق کا تصور بڑا ہی مجہول اور مبہم ہے۔ یہ برسوں
کی بے علمی اور گھٹیا قسم کے تصوف کا نتیجہ ہے۔ اقبال مسلمان کو اس

جود سے نکالنا چاہتے ہیں، اور ان کے سامنے حرکت، عمل اور عشق کا تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔

عشق قوت و طاقت ہونے کے علاوہ ام الکتاب بھی ہے۔ اسی وجہ سے یہ عشق مصطفوی بھی ہے۔ علم نے انسان کو انکار کی قوت عطا کر دی ہے وہ اپنے عقل پر اتنا کچھ نازاں اور فحشاں ہے کہ خدا کا وجود اسے محض بیکار سا لگتا ہے، اور اکثر تو اسکے وجود ہی سے انکار کرتا ہے۔ یہاں عشق اسکی رہبری کرتا ہے اور اس میں اقرار کی قوت پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کو خدا سے قریب تر کرتا ہے۔ وہ کائنات اور فائق کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ انسان کی حیثیت دہری ہے۔ ایک طرف کائنات ہے تو دوسری طرف کائنات الہیہ خود اس کا پیدا کرنے والا خدائے واحد ہے۔ اس حیثیت سے اس کے فرائض بھی مختلف ہیں۔ وہ خدا کا تابع ہے۔ کائنات اس کی تابع ہے۔ وہ اختیار نہیں رکھتا، اور وہ مختار بھی ہے۔ جہاں اسے اختیار حاصل ہے وہاں عقل جسکی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا اس کی مدد کرتی ہے اور عشق اس کی قوت و طاقت بن جاتا ہے اور جہاں وہ بے اختیار ہے عقل وہاں ابلیس کے انجام کو روشن کر دیتی ہے۔ یہاں عشق یگانگی بھی ایک قوت بن کر خدا سے اس کے رشتہ کو مضبوط تر بنادیتا ہے۔ یہاں عشق بے حد کثیف ہے۔ روح انسانی کی طرح جس انسان کے نزدیک عقل و عشق ہر کا بے ہو جاتے ہیں، تو اسے صاحب نظر بنا دیتے ہیں اور یہی انسان کی سوجا بھی ہے ۴

از جلال بے جا لے الاماں

از فراق بے وصالے الاماں

اقبال بھی اس جلال سے پناہ مانگتے ہیں۔ جس میں جمال کی کیفیت موجود

ہیں ہے اور اس فراق سے بھی حبسیں وصال کی چاہ نہیں ہے۔ ابلیس زندہ در گاہ ہے اور آدم بھی جرم کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا۔ لیکن ابلیس آدم میں بنیادی فرق بھی ہے۔ ابلیس اپنے علم کے زعم میں انکار ہی ہمارا کرتا ہے جبکہ آدم اس فراق کے باوجود وصل کی چاہت میں غلطاں و حیراں ہے۔

حلاج کی زبانی اقبال نے کیا خوب کہا ہے ۴

کم بگو آں خواجہ اہل فراق
تشنہ کام و از ازل خویش ایاق

ابلیس محروم ازلی ہے جبکہ آدم وصال کے لئے تڑپ رہا ہے۔ صوفیا کا مسلک یہی ہے کہ وہ روحانی قوت کے ذریعہ قرب الہی حاصل کر لیتے ہیں۔ رومی نے کہا ۴

ما ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم

ایں دو جہر انگذیریم سنز ما کبریا صحت

انسان آسمان سے برتر اور فرشتوں سے بلند تر ہے۔ وہ ان دونوں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ اس کی منزل مقام کبریا ہے۔ اقبال نے بھی کہا ہے ۴

شعلہ درگیر زد بر خس و خاشاک من

مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریا ست

اشفاق حسین رومی اور اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں جھتے ہیں کہ "یرداں" یہ کمند آور کا یہی مطلب ہے۔ یرداں کو آغوش میں لینے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان نہ ماں و مکان پر غالب آجائے۔ انسان قرب خداوندی سے اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کر سکتا ہے۔ "جہاں تسخیر کائنات ان کا بنیادی مقصد ہے وہیں قرب خداوندی کا حصول بھی اس کے لئے لازمی اور ضروری ہے، اور جس طرح انسان علم کی روشنی میں عشق کی قوت سے فائدہ اٹھا کر

تسخیر کا فرض انجام دیتا ہے۔ اسی طرح انسان علم کی بنیاد پر عشق کی بنیاد سے قرب الہی حاصل کر لیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ معرفت کا حصول جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جو لوگ جدوجہد کرتے ہیں تبارک و تعالیٰ انہیں راہیں دکھا دیتا ہے۔ اس کوشش میں انسان کیلئے علم یا عقل نہیں عشق کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

اقبال انسانیت کو قرب الہی کا درس دیتے ہیں یا کہتے ہیں ۹

بس اتنی سی حقیقت ہے ہمارے دین و ایمان کی

کہ اس جان جہاں کا آدمی دیوانہ ہو جائے

تو ان سے یہی مراد ہے کہ انسان محبت الہی اور عشق رسول کے ذریعہ اپنے اندر انسانی اقدار کو فروغ پانے کا موقع دیتا ہے۔ اقبال نے کسی عصیت یا تنگ نظری کی وجہ سے اپنی شاعری کے ذریعہ اسلام کی وکالت نہیں کی ہے۔ وہ راز درون میں خانہ کا حرم ہے۔ وہ اسی حقیقت سے خوب خوب واقف ہے کہ موجودہ دنیا جو حرص و ہوس کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ اسلامی قدروں کی ترویج کے بغیر جنت نشان نہیں بن سکتی۔ اور عالمی امن جو آج کے انسان کا سب سے بڑا مدعا ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔ وقتیکہ محمد عربیؐ کی تعلیمات کو نہ اپنالے۔ محمد عربیؐ اقبال کے مرد مومن ہیں۔ مکمل نمونہ۔ اقبالؒ کی شاعری شاعری اسی مرد مومن کے گو گو ممتی ہے۔ پیغمبر اسلام کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو انسان سے قریب تر کر دیا۔

اور ان فی تہذیب کی بنیاد احترام آدم ہی کو قرار دیا ۹

اصل تہذیب احترام آدم است

موجودہ انسان کا المیہ یہ نہیں ہے کہ انسان فی اقدار سے تہی دامن ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ وہ انسان اقداروں کی محرومی کے احساس سے بھی نابلدہ ہے۔ جس دن انسان اپنی اس محرومی سے آگاہ ہو جائے گا تو وہ انسان کا روشن تر دن ہوگا۔ انسان خود کی تلاش میں نکل پڑے گا، اور بالآخر اس منزل کو پا ہیے گا جس منزل کی نشاندہی محمد عربیؐ نے کی ہے۔ کلام اوتبال کو بھی اور کلام الہی کو کسی عصبیت کی عینک سے نہیں اسی وسیع تر پس منظر میں پڑھنا اور سمجھنا ہوگا۔

مری اسیری پہ شاخ گل نے یہ کہہ کے صیاد رلایا
کہ ایسے پر سوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ